باسمہٖ تعالیٰ

صدرِ مملکت نے فرمایا کہ معاشرہ کی کمزوریاں،
فاروقیت اپنائے بغیر دُور نہیں ہو سکتیں۔
اس سوال کا جواب کہ:

فاروقیتؓ کیا ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فاروقیت کیا ہے؟

روزنامہ جنگ (لاہور) نے اپنی ۱۶ اگست ۱۹۸۲ء کی اشاعت کے اداریہ میں، صدر مملکت، جنرل محمد ضیاء الحق کے یوم آزادی کے قوم سے خطاب کے حوالے سے لکھا ہے کہ انہوں نے فرمایا ہے کہ

ہم وہ سب کچھ نہیں کر پائے جس کی ہم تمنا کرتے ہیں۔ ہم اہلِ وطن کو خوشحالی اور مکمل احساسِ تحفظ بھی نہیں دے سکے جس کے ہم خواہاں تھے۔ ہم نے چادر اور چار دیواری کا ذکر کیا، اور اسے کسی حد تک نبھایا بھی لیکن ہم عوام کی توقعات پر پورے نہیں اتر سکے۔ صدر نے اس ضمن میں چوری، ڈکیتی، راہزنی، دھوکہ دہی کی وارداتوں، نیز جعل سازی اور تجارت میں ایمانداری کے فقدان کا ذکر کرتے ہوئے اصلاحِ معاشرہ کے لئے جہاد کا اعلان کیا۔ انہوں نے غربت، افلاس، تنگ نظری اور جہالت کے خلاف جہاد کرنے کا بھی عہد کیا اور کہا کہ وہ معاشرے میں ایسا معیار قائم کرنا چاہتے ہیں کہ رشوت اور سفارش کی لعنت کا خاتمہ ہو جائے کیونکہ اس لعنت نے معاشرہ کو غلیظ تر کر دیا ہے۔ انہوں نے قوم کو بھی دعوت دی کہ وہ اس لعنت کے خلاف ایک سال کے طویل جنگ میں شریک ہو اور رشوت اور سفارش کو ختم کر دے ..... انہوں نے کہا کہ یہ برائیاں محض باتوں سے ختم ہونے والی نہیں ہیں۔ ان کو ختم کرنے کے لئے دعا کے ساتھ دوا کی ضرورت ہے۔ اور یہ دوا بھی صدر نے تجویز کر دی، جب کہا کہ

معاشرے کی کمزوریاں فاروقیت اپنائے بغیر دور نہیں ہو سکتیں

ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ، یہ دیکھنے اور ماپنے کے لئے کہ معاشرہ میں اصلاح ہو رہی ہے یا نہیں، اور اگر ہو رہی ہے تو کس حد تک، صدرِ مملکت نے ایک ایسا مقیاس (ماپنے کا ذریعہ) تجویز کیا ہے جس سے ہم کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں رہ سکتے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ یہاں اسلامی نظام قائم ہوگا۔ اسلامی قوانینِ شریعت

نافذ ہوں گے۔ ہم اپنی سیرت کو اسلامی قالب میں ڈھالیں گے، تو نظری طور پر تو یہ بالکل ٹھیک ہوتا ہے، لیکن جب اسے عمل کے معیار پر پرکھا اور ناپا جائے تو اس میں ایک بنیادی کمی رہ جاتی ہے۔ ایک تو یہ کہ آج تک "اسلام" کا کوئی متفق علیہ مفہوم متعین نہیں ہوا۔ ہر فرقہ بلکہ ہر شخص کا اسلام کا مفہوم الگ الگ ہے۔ اور دوسرے یہ کہ یہ مفہوم نظری ہوتا ہے۔ محسوس شکل میں سامنے نہیں آتا۔ اس لئے متعین طور پر پرکھا اور ناپا نہیں جا سکتا کہ ہمارا نظام کس حد تک اسلامی ہو گیا ہے۔ اس میں خود فریبی یا مغالطہ آفرینی کا بڑا امکان ہوتا ہے۔ اسلامی نظام کا آغاز، حضور نبی اکرمؐ کے عہدِ ہمایوں میں ہوا اور وہ تکمیل تک دورِ فاروقیؓ میں پہنچا۔ لہٰذا اُس دور کی معاشرتی، معاشی، سیاسی زندگی اور خود سربراہِ مملکت کے ذاتی کردار میں اسلامی نظام کا صحیح نقشہ منعکس ہو جاتا ہے۔ بنا بریں صدرِ مملکت نے جو کہا ہے کہ ان خرابیوں کا ازالہ فاروقیت کو اپنائے بغیر نہیں ہو سکتا، اس سے ایک ٹھوس معیار سامنے آجاتا ہے جس سے ہم اپنے معاشرہ اور خود اپنی ذات، کا جائزہ لے سکتے ہیں۔

دورِ فاروقیؓ کے متعلق متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں، لیکن ان میں (ہمارے نزدیک) پرویز صاحب کی تصنیف "شاہکارِ رسالتؐ" کو خاص امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ انہوں نے اسے الدین (یعنی اسلامی نظام یا اسلامی مملکت) کے نقطۂ نگاہ سے مرتب کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ انہوں نے تاریخ کے صرف ان واقعات کو قابلِ قبول سمجھا ہے جو قرآن کریم کے خلاف نہیں اور جن سے صحابہ کبارؓ کی سیرتؓ کردار داغدار نہیں ہوتے۔ جہاں تاریخ میں کوئی ایسا واقعہ آیا ہے، انہوں نے اس کی نشاندہی کر دی ہے۔ اس اعتبار سے ان کی یہ کتاب قابلِ اعتماد ہے۔ "فاروقیت" کو مکمل طور پر سمجھنے کے لئے تو اس پوری کتاب کا مطالعہ ضروری ہے، لیکن اس خیال سے کہ جملہ قارئین کے لئے شاید یہ ممکن نہ ہو، ہم اس سے جستہ جستہ اقتباسات پیش کریں گے جن سے فاروقیت کے نمایاں خط و خال سامنے آجائیں گے۔ حوالہ شاہکارِ رسالتؐ کے صفحات کے ہیں۔

(٠)

خطباتِ خلافت

امورِ مملکت (خلافت) کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد آپ نے دو خطبات ارشاد فرمائے۔ ایک مختصر تھا اور دوسرا قدرے مفصّل۔ یہ خطبات گویا (آج کل کی اصطلاح میں) مملکت کے منشور تھے۔ مختصر خطبہ میں آپ نے فرمایا:-

"لوگو! میں تمہیں میں سے ایک انسان ہوں۔ اگر مجھے خلیفۂ رسول اللہؐ کی حکم عدولی گوارا ہو سکتی تو میں، ہرگز یہ ذمہ داری قبول نہ کرتا۔"[1]

[1] شاہ ولی اللہؒ نے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ اگر میں دیکھتا کہ کوئی اور صاحب اس بار کو مجھ سے بہتر طور پر اٹھا سکنے کے قابل ہیں تو میں اسے قبول نہ کرتا۔ (ازالۃ الخفاء)

آپ نے یہ الفاظ ایسے خلوص اور انکسار کے ساتھ کہے کہ سامعین کے دل کی گہرائیوں میں اتر گئے۔ چنانچہ انہوں نے محسوس کیا کہ حضرت ابوبکرؓ صدیق نے جو کہا تھا کہ خلافت کی ذمہ داریاں (حضرت) عمرؓ کی سختی کو نرمی سے بدل دیں گی وہ درست تھا۔

اس کے بعد حضرت عمرؓ نے کہا کہ لوگو! میں خدا سے تین دعائیں مانگتا ہوں۔ تم آمین[1] کہو۔ انہوں نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور نہایت عجز و الحاح سے کہا:۔

بارِ الٰہا! میں سخت ہوں۔ مجھے حق کی موافقت۔ اپنی رضاطلبی اور احساسِ آخرت کے لئے نرم کر دے۔

یہ کہہ کر آپ خاموش ہو گئے۔ سامعین نے آمین کہا، تو آپ نے دوسری دعا مانگی کہ

یا اللہ! میں کمزور ہوں مجھے قوی بنا دے تاکہ میں دین کے دشمنوں، منافقوں اور فحش کاروں کا مقابلہ کر سکوں۔ لیکن ایسا قوی نہیں کہ میں ان کے حق میں ظالم بن جاؤں اور ان پر دست درازی کرنے لگ جاؤں۔

آپ پھر خاموش ہو گئے۔ مجمع پر سناٹا چھا رہا تھا۔ لوگوں نے آمین کہا۔ تو آپ نے بارگاہِ رب العزت عرض کیا کہ

یا اللہ! میں بخیل ہوں۔ مجھے امورِ خیر کے لئے سخی بنا دے۔ لیکن اس سخاوت میں ریاکاری کا شائبہ نہ ہو۔

مجمع پر سکوت چھا رہا تھا۔ تھوڑے سے توقف کے بعد آپ نے فرمایا:۔

ایھا الناس! اللہ نے میرے رفقاء کے بعد، مجھے تم میں باقی رکھا ہے تاکہ وہ میرے ذریعے تمہاری اور تمہارے ذریعے میری آزمائش کرے۔ تمہارا جو معاملہ میرے سامنے آئے گا میں اسے کسی دوسرے پر نہیں چھوڑوں گا بلکہ خود سرانجام دوں گا۔ البتہ جو معاملہ ایسا ہو گا جس میں مجھے دوسروں کی معاونت کی ضرورت ہو گی تو اس کے لئے میں حتی الامکان ایسے لوگوں کو متعین کروں گا جن کی صداقت اور امانت میں شبہ نہ ہو۔ اگر وہ لوگ صحیح راستے پر چلیں گے تو میں ان کے ساتھ نیک سلوک کرونگا۔ اگر غلط رویہ اختیار کریں گے تو انہیں عبرتناک سزا دوں گا۔

اس کے بعد آپ نے سامعین سے کہا کہ

قرآن پڑھا کرو۔ اسی سے تمہاری قدر و منزلت ہو گی۔ اور اسی پر عمل کرو تاکہ تم حاملِ قرآن ہو جاؤ۔ اپنے نفوس کا وزن کرو اس سے پیشتر کہ تمہارا وزن کیا جائے۔ قیامت کے دن کے لئے اپنے آپ کو تیار کرو جب تم خدا کے سامنے پیش کئے جاؤ گے اور تمہاری کوئی بات پوشیدہ نہیں رہے گی۔

اس کے بعد پھر اپنے لئے ایک اور دعا مانگی جس میں کہا کہ

بارِ الٰہا! مجھے تفکر و تدبر قرآنی عطا فرما تاکہ میں جو کچھ قرآن سے پڑھوں اسے اچھی طرح سمجھ سکوں اور

---

[1] آمین عبرانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں ـــــ ہاں! یقیناً ایسا ہو گا ـــــ اس میں یقین کا تصور غالب ہوتا ہے۔ اسی سے لفظ ایمان ہے جس کے بنیادی معنی اس یقین کے ہیں جس سے قلب کو امن (اطمینان) حاصل ہو۔

اس کے لوازمات پر غور کر سکوں۔

یا اللہ! تو مجھے توفیق عطا فرما کہ میں جب تک زندہ رہوں تیری کتاب پر عمل پیرا رہوں۔ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ (شاہکارِ رسالت۔ صفحہ ۵۵ - ۵۷)

مفصّل خطبہ میں آپ نے پہلے یہ بتایا کہ وہ رسول اللہ اور حضرت صدّیق اکبر کے زمانے میں سخت گیر کیوں تھے۔ اس کے بعد فرمایا:۔

"اور اب کہ، اے لوگو! تمہارے معاملات کی ذمہ داری میرے کندھوں پر رکھ دی گئی ہے تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میری وہ سختی نرمی میں بدل گئی ہے۔ لیکن ان لوگوں کے لئے بدستور قائم ہے جو ظلم اور زیادتی سے کام لیں۔ رہے وہ لوگ جو امن و سلامتی سے رہتے اور جرأت ایمانی رکھتے ہیں، تو ان کے لئے میں سب سے زیادہ نرم ہوں۔ اگر کوئی شخص کسی کے ساتھ ظلم اور زیادتی کرے گا تو میں اسے اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک اس کا ایک رخسار زمین پر ٹکا کر دوسرے رخسار پر اپنا پاؤں نہ رکھ دوں، تاآنکہ وہ حق کے سامنے سپر انداز ہو جائے۔ لیکن اس تمام سختی کے باوجود، میں اہلِ حق کے لئے خود اپنے رخسار زمین پر رکھ دوں گا۔

لوگو! مجھ پر تمہارے کچھ حقوق ہیں جو میں تمہارے سامنے بیان کرتا ہوں۔ تم اپنے یہ حقوق مجھ سے حاصل کرو۔ تم پر میرا صرف یہ حق ہے کہ تمہارے خراج اور مالِ غنیمت میں سے جو اللہ تمہیں عطا کرے۔ (یعنی مملکت کی آمدنی میں سے) اپنے کفاف کے لئے لوں، لیکن اسے ناحق نہ لوں۔

تمہارا مجھ پر یہ حق ہے کہ جب تم میں سے کوئی میرے پاس آئے تو مجھ سے اپنا حق لے کر جائے۔

تمہارا مجھ پر یہ حق بھی ہے گا میں تمہارے عطیات اور وظائف میں اضافہ کروں اور تمہاری سرحدوں کو مستحکم کروں۔

اور یہ حق بھی کہ تمہیں ہلاکت میں نہ ڈالوں۔ تمہیں بلا ضرورت گھر واپس آنے سے نہ روکے رکھوں۔ اور جب تم کسی جنگ پر جاؤ تو ایک باپ کی طرح تمہارے اہل و عیال کی نگہ پرداخت کروں۔

اللہ کے بندو! اللہ سے ڈرو۔ میرا ہاتھ بٹاؤ۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں میری مدد کرو۔ تمہاری جو خدمات اللہ نے میرے سپرد کی ہیں ان کے متعلق مجھے نصیحت کرتے رہو۔ میں تم سے یہ کچھ کہہ رہا ہوں اور اپنے اور تمہارے لئے اللہ سے مغفرت طلب کر رہا ہوں۔ میں یوم الحساب کا منتظر ہوں۔ جب مجھے یہ بتانا ہوگا کہ میں نے تم سے کیا لیا اور اسے کیسے خرچ کیا۔

یہ کہہ کر آپ منبر سے اترے اور نماز پڑھائی۔" (حوالہ۔ صفحہ ۵۸)

واضح رہے کہ آج کل کی اصطلاح میں خلافت سے مراد اسلامی نظام یا اسلامی مملکت لی جائے گی۔ دورِ ملوکیت میں بادشاہت اور آمریت سب شامل ہوں گی۔

خلافت اور ملوکیّت (یا آمریّت) میں فرق

ایک دن حضرت عمرؓ نے حضرت سلمانؓ فارسی سے پوچھا کہ میں خلیفہ ہوں یا بادشاہ؟ انہوں نے کہا کہ اگر آپ نے مسلمانوں سے ایک درہم (یا اس سے کم بھی) وصول کیا اور اسے صحیح مقام پر صرف نہ کیا تو آپ بادشاہ ہیں خلیفہ نہیں۔ (ص ۶۲)

اس پر آپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ اسی قسم کے ایک سوال کے جواب میں ایک صاحب نے کہا:۔

خلافت اور شہنشائیت میں فرق ہے۔ خلیفہ عوام کے جملہ حقوق کا محافظ ہوتا ہے۔ وہ ہر انسان کا حق، حقدار کو دیتا ہے۔ وہ نہ ناجائز طور پر کسی سے کچھ لیتا ہے، نہ ناجائز خرچ کرتا ہے۔ الحمدُ للہ کہ آپ خلیفہ ہیں، بادشاہ نہیں۔ بادشاہ زبردستی کرتا ہے۔ ایک سے چھین کر دوسرے کو دیتا ہے۔ (ص ۶۲)

جیسا کہ آگے چل کر سامنے آئے گا، آپ کے نزدیک "جائز" وہ تھا جس کی اجازت قرآنِ مجید دیتا ہو۔ جس کی وہ اجازت نہیں دیتا وہ ناجائز ہے۔ آپ کے دور میں، عام مسلمانوں کے ذہن میں بھی خلیفہ اور بادشاہ کا فرق اس قدر واضح تھا کہ جب روم کے سفیر نے ان سے دریافت کیا کہ تمہارا بادشاہ کہاں ہے؟ تو اسے جواب ملا کہ "مالنا ملك۔ بل لنا امیر"۔ ہمارا کوئی بادشاہ نہیں، ہمارا صرف امیر ہے ——— اور قارئین کو معلوم ہوگا کہ امیر کے معنی ہیں صحیح راستے کی طرف راہ نمائی کرنے والا۔

اس کے بعد وہ اس سربراہِ مملکت (حضرت عمرؓ) کی تلاش میں نکلا، تو دیکھا کہ آپ اپنے چغے کو سر کے نیچے رکھے، بالو ریت پر دھوپ میں سو رہے ہیں اور آپ کا پسینہ پیشانی سے ٹپک کر زمین کو تر کر رہا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ ورطۂ حیرت میں گم ہو گیا اور بے ساختہ کہنے لگا کہ

عمرؓ! تو لوگوں سے عدل کرتا ہے اس لئے اس طرح بے خوف سوتا ہے۔ ہمارا بادشاہ ظلم کرتا ہے اس لئے وہ بیدار رہتا اور خوف زدہ رہتا ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرا دین برحق ہے۔ اگر میں قاصد کی حیثیت سے نہ آیا ہوتا تو اسی وقت اسلام قبول کر لیتا۔ اب میں جا کر واپس آؤنگا تو اسلام قبول کر لوں گا۔ (ص ۳۷۶)

آپ سے ایک دفعہ کسی نے پوچھا کہ آپ اپنے تجربہ کی بنا پر بتائیے کہ خلافت کسے کہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ، میں تو اتنا ہی جانتا ہوں کہ

خدا کے سامنے حساب دیتے وقت، یہ بتایا جا سکے کہ کہاں سے لیا تھا اور کسے دیا تھا۔ اگر اس کا جواب اطمینان بخش ہو تو یہ خلافت ہے ورنہ ملوکیت۔

خلیفہ کا کسی سے کچھ لینے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ مملکت کے واجبات وصول کرنے میں بھی یہ اصول کارفرما تھا کہ حکومت کسی شخص سے کچھ لینے کا حق اس وقت رکھتی ہے جب اس نے اس کے لئے کچھ مفید کام کیا ہو۔

ایک آزاد شدہ غلام (سعید) کا بیان ہے کہ میں حکومت کے واجبات جمع کرانے کے لئے حضرت عمرؓ کے پاس آیا تو انہوں نے پوچھا کہ کیا تم نے حکومت کے بیت المال سے کچھ فائدہ بھی اٹھایا ہے؟ میں نے کہا کہ نہیں۔ ابھی تک تو میں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ پھر اپنی رقم واپس لے جا۔ جب تمہیں ہماری طرف سے کچھ مل جائے تو پھر آنا۔" (ص ۳۶۸) اس چھوٹے سے واقعہ سے جو عظیم اصول مستنبط ہوتا ہے وہ اسلامی اور غیر اسلامی مملکت میں فرق کے حدود کی ایک بیّن نشاندہی کرتا ہے۔

(۰)

خلیفہ کا وظیفہ اور ذاتی اخراجات

حضرت عمرؓ نے بطور سربراہ مملکت جو وظیفہ اپنے لئے مقرر کیا وہ حسب ذیل تھا:۔

کپڑوں کے دو جوڑے، ایک گرمی کا ایک سردی کا۔ حج اور عمرہ کے لئے ایک ایک احرام۔ میرے اور میرے اہل و عیال کے لئے فی کس اتنا کھانا جو قریش کے ایک آدمی کی خوراک ہے۔ نہ اس سے زیادہ نہ اس سے کم۔ اس کے بعد میں مسلمانوں کا ایک فرد ہوں۔ جو حال ان کا سو حال میرا۔ (ص ۳۷۱)

اس کھانے کا معیار یہ تھا کہ ایک وقت میں صرف ایک سالن ہونا چاہیئے۔ اور وہ بھی اس پابندی کے ساتھ کہ ایک دفعہ کھانے میں گوشت اور دودھ آیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ دو سالن ہیں۔ ان میں سے ایک وقت میں صرف ایک ہی کھایا جائے گا۔ اور وہ بھی وہ جس کے متعلق اطمینان ہو کہ وہ عام مسلمانوں کو میسّر آسکتا ہے۔ (ص ۳۷۳)

ایک دفعہ کوفہ کا عامل آپ سے ملنے آیا تو آپ اسے اپنے ساتھ گھر لے آئے اور اس کے سامنے اندر سے آپ کا کھانا آگیا۔ کھانے میں جَو کی روٹی۔ زیتون کا تیل اور موٹا پسا ہوا نمک تھا۔ اس مہمان نے کہا کہ آپ جَو کی روٹی کیوں کھاتے ہیں۔ گیہوں کی کیوں نہیں کھاتے؟ آپ نے جواب میں فرمایا کہ

اس وقت عمرؓ کو یقین ہے کہ مملکت میں ہر فرد کو جَو کی روٹی مل رہی ہے۔ وہ گیہوں کی روٹی اس دن کھائے گا جس دن اسے اس کا اطمینان ہو جائے گا کہ ہر شخص کو گیہوں کی روٹی مل رہی ہے۔ (ص ۳۷۳)

ایک دفعہ ایک دوست کے ہاں دعوت تھی جس میں جو کھانا سامنے آیا وہ قدرے پُرتکلف تھا۔ آپ نے میزبان سے کہا کہ

یہ تو ہمارے لئے ہوا۔ ان محتاجوں کے لئے کیا ہے جو بھوکے مر رہے ہیں اور جنہیں نانِ جویں تک میسّر نہیں۔

حضرت خالد بن ولیدؓ پاس کھڑے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ان کے لئے جنّت ہے۔ یہ سن کر آپ آبدیدہ ہو گئے اور کہا کہ

خالدؓ! اگر ہماری قسمت میں یہ ہے اور ان کے مقدر میں جنت، تو پھر سوچو کہ یہ فرق کتنا بڑا ہوا؟ (ص ۳۷۴)

قحط کے زمانے میں آپ نے التزام یہ رکھا کہ ایک مشترکہ دسترخوان پر (جو کچھ میسر آئے) سب مل کر کھالیں۔ انہی میں آپ خود بھی شریک تھے۔ آپ اس قسم کی غذا کے عادی نہیں تھے اس لئے آپ کی صحت خراب ہوگئی اور رنگت سیاہ پڑ گئی۔ رفقاء نے کہا کہ آپ یہ غذا نہ کھائیے۔ آپ نے فرمایا کہ میں یہ غذا اس لئے کھاتا ہوں کہ

اگر مجھ پر وہ کچھ نہ گزرے جو عوام پر گزرتی ہے تو مجھے ان کی تکلیفوں اور پریشانیوں کا احساس کیسے ہو سکتا ہے؟ اور جب مجھے ان کا احساس نہیں ہوگا تو میں انہیں رفع کرنے کی فکر کیسے کر سکوں گا؟ (ص ۳۷۴)

دوسرے مقام پر آپ نے فرمایا کہ

اگر میں پیٹ بھر کر کھڑا ہو جاؤں اور دوسرے انسان بھوکے ہوں تو اس کے ایک ہی معنی ہیں کہ میں لوگوں کا اچھا والی نہیں ہوں۔ (ص ۳۷۴)

حالتِ سفر میں

یہ تو رہا کھانے کا معاملہ۔ اب سفر کی کیفیت ملاحظہ فرمائیے۔ دین کے نظام میں حج میں شرکت، امیرالمومنین اور عمالِ حکومت کی سرکاری ڈیوٹی تھی۔ اس زمانے میں حج، انفرادی عبادت کا نام نہیں تھا۔ یہ اسلامی مملکت کے زیرِ اہتمام اُمّت کا اجتماع تھا جس میں مملکت سے متعلق اہم امور پر مشورے بھی ہوتے تھے اور لوگوں کی شکایات کا ازالہ بھی کیا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کے اخراجات حکومت کو برداشت کرنے ہوتے تھے۔ یہ سفر کس "شان و شکوہ اور انصرام و انتظام" سے ہوتا تھا اس کا اندازہ حضرت عبداللہ بن عامر بن ربیعہؓ کی اس روایت سے لگ سکتا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ

میں ایک دفعہ حج کے سفر میں حضرت عمرؓ کے ساتھ رہا۔ آپ کے لئے نہ کہیں خیمہ لگایا گیا، نہ سائبان۔ نہ کوئی عمارت ایسی تھی جس میں آپ آرام کر سکتے۔ جہاں آرام کرنا ہوتا، ایک چادر کسی درخت پر ڈال دیتے اور اس کے سائے میں ہم سب آرام کر لیتے۔ (ص ۳۷۵)

اس سادگی اور بے سروسامانی کے باوجود آپ اس کے اخراجات پر کڑی نگاہ رکھتے تھے۔ حضرت یسارؓ بن نمیر کی روایت ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ اس مرتبہ حج پر کل کیا خرچ آیا۔ میں نے کہا پندرہ دینار۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ ہم نے بیت المال کا بہت سا روپیہ اڑا دیا۔ (ص ۳۷۵)

مکان آپ کا وہی تھا جس میں آپ زمانۂ خلافت سے پہلے رہا کرتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت عمرو بن العاصؓ نے انہیں اطلاع دی کہ انہوں نے صدرِ مملکت کے لئے مصر میں ایک مکان بنوایا ہے۔ اس پر آپ نے انہیں لکھا کہ "بھائی! ذرا سوچو۔ حجاز میں رہنے والے کا مصر میں مکان کیسے ہو سکتا ہے؟..... اس مکان کو

رفاہِ عامہ کے لئے کھلا رہنے دو۔" (ص۳۷۵)

سفرِ بیت المقدس

فتح بیت المقدس کے وقت آپ جابیہ میں تشریف فرما تھے۔ بیت المقدس کے اسقف نے صلح کے لئے یہ شرط لگا دی کہ مسلمانوں کے سربراہِ مملکت خود آکر معاہدۂ صلح پر دستخط کریں۔ جابیہ سے بیت المقدس تک آپ کے "شاہانہ" سفر کی تفصیلی روئداد تاریخ کی مختلف کتابوں میں مذکور ہے۔ اس کا ملخص یہ ہے:۔

"بائیس لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی مملکت کا یہ سربراہ فاتح ایران و روم کی حیثیت سے عازمِ سفر ہوا تو بایں نمط کہ ایک اونٹنی پر سوار تھے جس پر ایک اونی کمبل پڑا تھا۔ یہ کمبل بحالتِ قیام بستر کا کام بھی دیتا تھا۔ سر پر نہ ٹوپی تھی نہ عمامہ۔ دونوں پاؤں بے رکاب کجاوے میں ایک دوسرے سے لگے لٹکا رہے تھے۔ خرجی کھال کی تھی جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی۔ اسے ضرورت کے وقت تکیہ بنا لیا جاتا تھا۔ ادھر اُدھر دو تھیلے لٹک رہے تھے جن میں سے ایک میں ستو تھے اور دوسرے میں کھجوریں۔ سامنے پانی کا مشکیزہ تھا۔ رفقاء کی جماعت ساتھ تھی۔ آپ ہر روز صبح اپنے رفقاء کے ساتھ بیٹھتے۔ اپنا زادِ راہ دسترخوان پر رکھ دیتے جسے سب مل کر کھا لیتے۔ راستے میں چلتے بھی جاتے اور اپنے ہم سفروں کو دین کی تعلیم بھی دیتے جاتے۔ بعض روایات یوں ہے کہ ایک ایک اونٹ دو دو سواروں کے حصے میں آیا تھا۔ اور آپ کا زمیل آپ کا غلام (ملازم) تھا جس سے یہ پایا تھا کہ ایک منزل آپ سوار ہوتے اور وہ غلام مہار پکڑتا اور دوسری منزل وہ (غلام) سوار ہوتا اور آپ مہار پکڑتے۔ ایک جگہ راستے میں پانی آگیا تو آپ اونٹنی سے اترے۔ موزے اتار کر ہاتھ میں پکڑ لئے اور اونٹنی کو ساتھ لے کر پانی میں اُتر گئے۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے دیکھا تو کہا کہ آج آپ نے وہ کام کیا ہے جس کی اہلِ زمین کے نزدیک بڑی عظمت ہے۔ آپ نے یہ کیا اور وہ کیا ہے۔ آپ نے سنا تو فرمایا۔

ہماری عزت اسلام کا صدقہ ہے

"ابو عبیدہ! یہ بات تمہارے کہنے کی نہیں تھی۔ ہم سب سے زیادہ غریب، سب سے زیادہ حقیر اور سب سے زیادہ قلیل تھے۔ اللہ نے ہمیں اسلام سے عزت دی۔ یہی ہمارے لئے وجہ شرف ہونا چاہیئے۔ اگر ہم نے اللہ کے سوا کسی اور سے عزت طلب کی تو اللہ ہمیں ذلیل کر دے گا۔"

بیت المقدس سے کچھ فاصلہ پر تھے کہ سواروں کا وہ دستہ آپہنچا جسے حضرت ابو عبیدہؓ نے آپ کے استقبال کے لئے بھیجا تھا۔ اس وقت کیفیت یہ تھی کہ آپ نمدے کا کُرتہ پہنے ہوئے تھے جس میں چودہ پیوند لگے ہوئے تھے، اور ان میں بعض پیوند چمڑے کے تھے۔ ہمراہیوں نے عرض کیا کہ آپ ایک نئے ملک میں، اجنبی قوم کے ہاں فاتح کی حیثیت سے جا رہے ہیں۔ بہتر ہو کہ آپ اونٹنی کے بجائے اس ترکی گھوڑے پر سوار ہو جائیں اور وہ لباس پہن لیں جسے حضرت ابو عبیدہؓ نے آپ کے لئے بھیجا ہے۔ آپ نے ان کا مشورہ قبول فرما لیا اور وہ لباسِ فاخرہ پہن کر ترکی گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ چار ہی قدم چلے ہوں گے تو گھوڑے سے اتر گئے اور اپنے رفقاء سے کہا کہ "عزیزانِ من! تم میری اس لغزش سے درگذر کرو۔ اللہ قیامت میں تمہاری لغزش سے درگذر

کرے گا جس نخوت اور تکبر نے اس وقت میرے دل میں راہ پائی وہ یقیناً تمہارے امیر کو ہلاک کر دیتے۔" اس کے بعد وہ پوشاک اتار کر پھر وہی پیوند لگے کپڑے پہن لئے۔

آگے گئے تو حضرت ابو عبیدہؓ، حضرت خالد بن ولیدؓ اور حضرت یزید بن سفیانؓ آپ کے استقبال کے لئے آئے۔ انہوں نے ریشمی کپڑے پہن رکھے تھے۔ آپ نے دیکھا تو سخت افروختہ ہوئے اور کہا کہ، تم لوگ اتنی جلدی بدل گئے۔ تم نے دو ہی برس میں اس قسم کی تن آسانی اختیار کر لی۔ اگر تمہارا یہی طرزِ عمل رہا تو، خدا کی قسم، خدا تمہاری جگہ دوسری قوم لے آئے گا اور تمہاری حکومت اسے دے دے گا کہ حریر و اطلس پہننے والی قومیں حکومت کی اہل نہیں رہتیں۔ انہوں نے معذرت چاہی اور عرض کیا کہ امیر المؤمنین! ہم نے یہ کرتے، اس قوم کی خاطر اوپر سے پہن رکھے ہیں۔ دیکھ لیجئے ان کے نیچے وہی ہتھیار موجود ہیں۔ اس پر آپ کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔"

لیجئے! یہ "شاہانہ جلوس" داخلِ بیت المقدس ہو گیا۔ اُس قوم کا سردار، جلوس کے استقبال کے لئے آیا تو آپ نے اس سے فرمایا:۔

> میرا کرتہ سفر کی وجہ سے پھٹ گیا ہے۔ اسے دھلوا بھی دیجئے اور سی بھی لا دیجئے۔ اور اتنی مدت کے لئے مجھے کوئی اور کرتہ دے دیجئے۔ اس نے وہ کرتہ بھی دھوا اور سی دیا اور ایک اور کرتہ بھی تیار کر لیا اور کہا کہ اسے میری طرف سے قبول فرما لیجئے۔ آپ نے اپنا کرتہ پہن لیا اور اس کا کرتہ واپس کرتے ہوئے فرمایا کہ میرا کرتہ اس سے زیادہ پسینہ جذب کرتا ہے۔

اس سردار نے یہ بھی کہا تھا کہ آپ شہر میں داخل ہو رہے ہیں۔ ذرا اچھے کپڑے پہن لیجئے اور گھوڑے پر سوار ہو جائیے۔ اس سے رومیوں کی نگاہ میں آپ کی عظمت بڑھے گی۔ اس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ

ساری عزت اسلام سے ہے

خدا نے ہمیں جو عزت دی ہے وہ اسلام سے ہے ان اضافی چیزوں سے نہیں۔ اس لئے ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔

سچ ہے۔ جب تک مسلمانوں نے اسلام کو اپنے لئے وجۂ عزت و شرف سمجھا وہ آسمانِ عظمت و وقار کے درخشندہ ستارے بن کر چمکے۔ جب انہوں نے اسے چھوڑ دیا تو ان بلندیوں سے ٹوٹے ہوئے تاروں کی طرح گرے اور فضائے زمانہ کی گردش میں پس کر راکھ ہو گئے۔

خدا ایں سخت جاں را یار بادا
کہ افتاد است از بام بلندے " (حوالہ مذکورہ۔ صفحہ ۱۹۸)

اقربا پر پابندیاں

آپ نے ان امور میں جس قدر پابندیاں اپنے آپ پر عائد کر رکھی تھیں، ان سے کہیں زیادہ قدغن اپنے اہل و عیال پر بھی لگا رکھی تھی۔ چنانچہ آپ کا معمول تھا کہ

جب لوگوں کو کسی بات سے منع کرتے تو اپنے گھر والوں کو جمع کر کے، ان سے کہتے کہ میں نے لوگوں کو فلاں فلاں چیز سے منع کیا ہے۔ یاد رکھو! لوگ تمہاری طرف، اس طرح دیکھ رہے ہیں جس طرح پرندہ گوشت کی طرف دیکھتا ہے۔ اگر تم بچو گے تو وہ بھی بچیں گے اور اگر تم پھنسو گے تو وہ بھی پھنسیں گے۔ اگر تم میں سے کسی شخص نے ان باتوں کا ارتکاب کیا تو خدا کی قسم! میں اپنے ساتھ تمہارے تعلق کی وجہ سے تمہیں دُگنی سزا دوں گا۔ اب تمہیں اختیار ہے۔ جو چاہے حدود سے تجاوز کرے، جو چاہے ان کے اندر رہے۔

اور یہ "دُگنی سزا" کا فیصلہ قرآن کریم کے اس ارشاد کے مطابق تھا جس میں نبی اکرمؐ کی ازواجِ مطہراتؓ سے کہا گیا تھا کہ یاد رکھو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو۔ تم میں سے جو کسی جرم کی مرتکب ہوگی اسے دُگنی سزا ملے گی۔ (۳۳/۳۰) حضرت عمرؓ نے اپنے ارشادِ گرامی سے اس نکتہ کی وضاحت کر دی کہ قرآن کا وہ حکم مملکتِ اسلامیہ کے ہر سربراہ پر یکساں عائد ہوتا ہے۔ (حوالہ۔ ص ۲۹۷)

بیوی کو تحفہ

اس باب میں آپ کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ (گورنر) نے آپ کی بیوی (حضرت) عاتکہ کو ایک سجّادہ بطور تحفہ دیا جو گز بھر لمبا اور چند بالشت چوڑا تھا۔ آپ کو معلوم ہوا تو حضرت ابوموسیٰؓ کو بلا کر سخت ڈانٹا۔ سجّادہ ان کے سر پر دے مارا۔ اور کہا کہ خبردار جو آئندہ ایسی حرکت کی۔

ملکۂ روم کا ہدیہ

ایک دفعہ شاہِ روم کا قاصد آیا تو ملکہ کی طرف سے "فرمانروائے مملکتِ اسلامیہ کی بیگم" کے لئے ہدیۂ سلام لایا۔ آپ کی بیوی نے ایک دینار قرض لیا، عطر خریدا، اور اُسے شیشیوں میں بند کر کے ملکۂ روم کو بھیج دیا۔ اس نے تحفہ موصول ہونے پر، انہی شیشیوں کو جواہرات سے بھر کر واپس بھیج دیا۔ آپ کو معلوم ہوا تو آپ نے سارے جواہرات فروخت کر کے، ایک دینار بیوی کو دے دیا اور باقی رقم بیت المال میں داخل کر دی۔ اور بیوی کو آئندہ محتاط رہنے کی تلقین کی۔

خوشبو لگی رہ گئی

بیت المال میں خوشبو آتی تو آپ اپنی بیوی کو دے دیا کرتے کہ وہ اسے فروخت کر کے رقم بیت المال میں جمع کرا دے۔ ایک دفعہ بیوی نے خوشبو بیچی تو جو انگلیوں سے لگی رہ گئی اسے اپنے دوپٹے پر مل لیا۔ خوشبو نے بہرحال غازی کر دینی تھی۔ اس نے کر دی۔ تو آپ نے بیوی سے کہا کہ تمہیں خوشبو بیچنے کے لئے دی گئی تھی، نہ اس لئے کہ تو مسلمانوں کے مال سے نفع اندوز ہو جائے۔ یہ کہہ کر اس کے دوپٹے کو دھو ڈالا۔ اس پر بھی خوشبو نہ گئی تو اسے مٹی سے ملا۔ پھر سونگھا۔ اور جب تک خوشبو اُتر نہیں گئی، ایسا ہی کرتے رہے۔

مشک کا وزن

ایک دفعہ بحرین سے کچھ مشک آئی تو آپ نے کہا کہ کوئی عورت صحیح وزن کرنے والی مل جائے تو اس سے وزن کرا لیا جائے۔ آپ کی بیوی (عاتکہ) نے کہا کہ

میں خوب تولنا جانتی ہوں۔ لائیے۔ میں وزن کئے دیتی ہوں۔

آپ نے کہا کہ نہیں، تو نہیں۔ بیوی نے کہا کہ کیوں؟ فرمایا کہ تو مشک تولے گی۔ پھر جو ہاتھوں سے لگی رہ جائے گی اُسے سر اور گردن پر (یوں یوں) مل لے گی۔ اور اس طرح مسلمانوں کے مال سے نفع اندوز ہو جائے گی۔ میں یہ طرح نہیں ڈالنا چاہتا۔

بیٹے کے اونٹ

آپ کے بیٹے، حضرت عبداللہؓ کا بیان ہے کہ "میں نے کچھ اونٹ خریدے اور انہیں سرکاری چراگاہ میں بھیج دیا۔ وہ موٹے ہو گئے تو انہیں بازار میں فروخت کرنے کے لئے لے آیا۔ اتفاق سے اسی وقت حضرت عمرؓ کا گزر ادھر سے ہوا۔ انہوں نے پوچھا کہ ایسے فربہ اونٹ کس کے ہیں؟ میں نے جواب دیا تو پوچھا کہ ایسے موٹے تازے کس طرح ہو گئے۔ میں نے کہا کہ میں نے انہیں سرکاری چراگاہ میں بھیج دیا تھا۔ تاکہ جو فائدہ دوسرے مسلمان اٹھاتے ہیں، میں بھی اٹھاؤں۔

یہ سن کر آپ کو سخت غصہ آیا۔ کہا کہ عام مسلمانوں کا ذکر کیوں کرتے ہو۔ کہو کہ امیرالمؤمنین کے بیٹے کے اونٹ تھے اس لئے حکومت کی چراگاہ میں بھیج دیئے۔ سنو! اونٹ فروخت کرو۔ راس المال رکھ لو اور سارا منافع بیت المال میں جمع کرا دو!

بیت المال کا روپیہ اور بیٹے

حضرت عمرؓ کے بیٹے عبداللہؓ اور عبیداللہؓ جہاد سے واپس آ رہے تھے۔ راستے میں بصرہ کے گورنر حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے ملے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے کچھ روپیہ بیت المال میں داخل کرنے کے لئے بھیجنا ہے۔ وہ لیتے جاؤ۔ میں وہ روپیہ تمہیں بطور قرض دیئے دیتا ہوں۔ تم اس سے کچھ عراقی مال خرید لو۔ مدینے جا کر مال بیچ دینا۔ اصل بیت المال میں جمع کرا دینا اور منافع خود رکھ لینا۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا تو بیٹوں کی طلبی ہو گئی۔ دریافت کرنے پر انہوں نے کہا کہ گورنر نے یہ روپیہ انہیں ادھار دے دیا تھا۔ اس سے انہوں نے کاروبار کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ کیا گورنر نے سارے لشکر کو اسی طرح ادھار دیا تھا یا صرف تم دونوں کو؟ انہوں نے کہا کہ سارے لشکر کو تو نہیں دیا تھا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ پھر اس نے تمہارے ساتھ یہ ترجیحی سلوک اس لئے کیا کہ تم امیرالمؤمنین کے بیٹے تھے۔ جاؤ! مال اور نفع دونوں بیت المال میں جمع کرو۔

مجلسِ مشاورت کے بعض رفقاء نے مداخلت کی تو بصد مشکل آپ اس پر راضی ہوئے کہ نصف منافع انہیں دے دیا جائے۔" (حوالہ۔ صـ ۲۱ - ۳۱۹)

ام المؤمنین حضرت حفصہؓ آپ کی چہیتی بیٹی تھیں۔ ایک دفعہ آپ کے پاس کچھ مال آیا تو وہ آئیں اور کہا کہ اس میں سے کچھ مجھے بھی دے دیجئے۔ فرمایا کہ تمہیں کیسے دے دوں؟ انہوں نے کہا کہ قرآن کریم میں اقربا کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم آیا ہے۔ اور میں آپ کے اقربا میں سے ہوں۔ یہ سُن کر آپ مسکرائے اور کہا کہ بیٹی! باپ کو دھوکا دیتی ہو۔ وہ حکم ذاتی مال کے لئے ہے، اور یہ میرا ذاتی مال نہیں۔ مسلمانوں کا ہے اس

لئے اس پر قرآن کے حکم کا اطلاق نہیں ہوتا۔ جاؤ بھاگ جاؤ۔ (ص ۳۲۲)

اِس سے بھی آگے بڑھئے۔

آپ کا معمول تھا کہ کوئی پھل یا کھانے پینے کی کوئی اور اچھی چیزیں آتیں تو انہیں حصہ رسدی امہات المؤمنین (یعنی نبی اکرمؐ کی ازواجِ مطہرات) کو تحفتہً بھیجتے۔ حضرت حفصہؓ ام المؤمنین بھی تھیں، لیکن اس کے ساتھ حضرت عمرؓ کی بیٹی بھی۔ آپ امہات المؤمنینؓ کے حصے لگاتے وقت، حضرت حفصہؓ کا حصہ سب سے آخر میں لگاتے کہ اگر مقدار میں کمی رہ جائے تو وہ آپ (حضرت حفصہؓ) کے حصہ میں ہو! (ص ۳۲۳)

احتیاط کی انتہا ملاحظہ فرمائیے:۔

(حضرت) معیقیبؓ بیت المال کے خزانچی تھے۔ ایک دن بیت المال میں جھاڑو دینے لگے تو کوڑے

ایک درہم

میں سے ایک درہم (اس وقت کا کم از کم سکہ) ہاتھ لگا۔ اتفاق سے حضرت عمرؓ کے گھر کا ایک بچہ پاس کھڑا تھا۔ خزانچی نے وہ درہم اس بچے کو دے دیا، اور گھر چلا گیا۔ ابھی گھر پہنچا ہی تھا کہ امیر المؤمنین کا بلاوا آ گیا۔ وہ آیا تو دیکھا کہ وہی درہم آپ کے ہاتھ میں تھا۔ کہا کہ معیقیبؓ! میں نے تمہارے ساتھ کونسی زیادتی کی تھی جو تم نے مجھ سے اس طرح بدلہ لینا چاہا۔ تم سوچو کہ قیامت کے دن جب اُمّتِ محمدؐیہ مجھ سے اس درہم کی بابت پوچھے گی تو میں کیا جواب دوں گا۔ (ص ۲۶۵)

یہ تو اقربا کی بات تھی۔ ایک دفعہ آپ نے کسی رفیق سے کہا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور تمہیں اپنا دوست سمجھتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ خدا کے لئے مجھے بخشیئے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ جو مراعات مجھے اس وقت حاصل ہیں ان میں سے کچھ چھیننے کا ارادہ ہے! اللہ اکبر ـــــ سربراہِ مملکت سے جس قدر قریبی تعلق، اتنی ہی کم مراعات! (ص ۳۲۲)

دیانت و امانت

دیانت کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ آپ کی طبیعت ناساز ہو گئی۔ علاج کے لئے شہد تجویز کیا گیا۔ شہد بیت المال میں موجود تھا لیکن امیر المؤمنین کے ہاں راشن میں نہیں آتا تھا۔ آپ نے خود شہد نہیں لیا۔ کابینہ کی میٹنگ بلائی اور اس کی منظوری کے بعد شہد لیا۔ (ص ۳۲۳)

امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کی روایت ہے کہ ایک صاحب حضرت عمرؓ کے پاس تھوڑا سا دودھ لائے جسے پی کر آپ خوش ہوئے۔ پوچھا کہ یہ دودھ آپ کہاں سے لائے ہیں۔ اس نے کہا کہ فلاں چشمہ پر بیت المال کے اونٹ جمع تھے اور نگران ان کا دودھ دوھ رہے تھے۔ اس میں سے انہوں نے تھوڑا سا دودھ مجھے بھی دے دیا۔ یہ سنتے ہی حضرت عمرؓ نے حلق میں انگلی ڈالی اور قے کر کے دودھ نکال دیا اور فرمایا کہ بیت المال سے کچھ بھی بلا قیمت لینا جائز نہیں۔ (ص ۳۹۱)

اس دیانت اور امانت کا نتیجہ کیا تھا، اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگائیے۔ جب ایران (مدائن)

فتح ہوا تو اس کا مال غنیمت مدینہ پہنچا۔ اسے دیکھ کر اہل مدینہ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ زر و جواہرات، مال و دولت۔ نوادرات کی اتنی کثرت تھی کہ ان کا ذہن اسے باور نہیں کرتا تھا۔ حضرت سعد بن وقاصؓ نے اس مال کو بھیجتے وقت، جو خط امیر المؤمنین کو بھیجا تھا اس میں لکھا تھا کہ اس مال کی کثرت یقیناً وجہ حیرت ہوگی لیکن اس سے بھی باعث مسرت امر یہ ہے کہ یہ تمام زر و جواہرات مسلمان سپاہیوں کو ایسے ایسے مقامات سے ملے تھے جہاں انہیں دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ لیکن ان میں سے کسی نے ایک سوئی بھی اپنے پاس نہیں رکھی۔ سب کچھ لا کر مرکز میں جمع کرا دیا۔ یہ پڑھ کر حضرت عمرؓ کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے اور کہا کہ اس قسم کی دیانت اور امانت کی مثال اور کہاں مل سکے گی۔

حضرت علیؓ پاس کھڑے تھے۔ انہوں نے کہا کہ عمرؓ! تمہیں معلوم ہے کہ سپاہیوں کی اس دیانت اور امانت کا راز کیا ہے؟ وہ راز یہ ہے کہ

> چونکہ آپ کا دامن پاک ہے اس لئے آپ کی رعایا بھی پاک دامن ہے۔ اگر آپ کی نیت ٹھیک نہ ہوتی تو رعایا کی نیت میں بھی فرق آجاتا۔ (ص ۱۸۲)

سربراہ مملکت کا کیریکٹر رعایا پر کس قدر اثر انداز ہوتا ہے، اس کا اندازہ اس (عمومی سے) واقعہ سے لگائیے۔

دودھ میں پانی ملانے والی لڑکی

ایک رات آپ گشت کرتے کرتے تھک گئے تو ایک مکان کے باہر اس کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ سنا تو اندر ایک عورت اپنی لڑکی سے کہہ رہی تھی کہ اٹھو۔ اور دودھ میں تھوڑا سا پانی ڈال دو۔

اس نے کہا۔ اماں! تمہیں معلوم نہیں کہ امیر المؤمنین نے دودھ میں پانی ملانے سے سختی سے منع کر رکھا ہے۔

ماں نے کہا۔ اٹھو۔ اور دودھ میں پانی ڈال۔ اس جگہ کونسا امیر المؤمنین تمہیں دیکھ رہا ہے۔

بیٹی نے کہا۔ اماں! امیر المؤمنین نہیں دیکھ رہا، تو وہ خدا تو دیکھ رہا ہے جس کا حکم امیر المؤمنین ہم تک پہنچاتے ہیں۔

صبح ہوئی تو آپ نے اپنی بیوی سے کہا کہ جلدی سے جا اور دیکھ کہ وہ لڑکی شادی شدہ ہے یا ابھی اس کی شادی ہونی ہے۔ اگر وہ غیر شادی شدہ ہے تو اسے بہو بنا کر گھر لے آ کہ اس قسم کی نعمتیں روز روز نہیں ملا کرتیں۔ معلوم ہوا کہ لڑکی بیوہ ہے۔ آپ نے اپنے بیٹے عاصم سے اس کی شادی کر دی۔ (حوالہ۔ ص ۳۰۱)

یہی وہ اصول تھا جسے حضرت عمرؓ نے، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے نام اپنے ایک خط میں، ان الفاظ میں رقم فرمایا تھا کہ

> یاد رکھو! جب حاکم بگڑ جاتا ہے تو رعایا بھی بگڑ جاتی ہے۔ سب سے زیادہ بدبخت وہ شخص

ہے جس کی وجہ سے اس کی رعایا بگڑ جائے۔ (ص ۱۲۹)

اور اسی خط میں ایک فقرہ یہ بھی تھا کہ

اگر تم یہ جاننا چاہو کہ اللہ کے ہاں تمہارا مقام کیا ہے تو یہ دیکھو کہ اللہ کی مخلوق تمہیں کیا سمجھتی ہے۔ اچھی طرح جان لو کہ اللہ کے ہاں تمہارا مرتبہ وہی ہے جو مخلوق کے ہاں ہے۔ (ص ۱۲۹)

قابلِ اعتماد کون ہے

نماز، روزہ احکام خداوندی کی اطاعت ہے (بلکہ اکثر اوقات انہیں محض عادتاً ادا کر لیا جاتا ہے) لیکن (حضرت عمرؓ کے معیار کی رُو سے) قابلِ اعتماد اسی کو سمجھا جا سکتا ہے جس کے لوگوں کے ساتھ معاملات درست ہوں۔ اس سلسلہ میں وہ واقعہ مشہور ہے کہ

ایک دفعہ ایک شخص سے آپ نے کہا کہ اپنی بات کی تائید کے لئے کسی ایسے آدمی کو لاؤ جو اعتماد کے قابل ہو۔ اس نے ایک آدمی کا نام لیا تو آپ نے اس سے پوچھا کہ

کیا تم نے کبھی اس کے ساتھ سفر کیا ہے؟

اس نے کہا۔ نہیں۔

پھر پوچھا۔ کیا تم کبھی اس کے ہمسایہ رہے ہو؟

اس نے کہا۔ نہیں۔

آپ نے پھر پوچھا کہ

کیا اس کے ساتھ تمہارا کوئی معاملہ پڑا ہے؟

جب اس نے اس پر بھی کہا کہ نہیں، تو آپ نے فرمایا کہ

پھر تم اس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم نے اسے مسجد میں سر جھکاتے، سر اٹھاتے دیکھ لیا ہوگا۔ اور اس سے سمجھ لیا کہ وہ قابلِ اعتماد ہے۔ (ص ۲۴۴)

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی طرف جس خط کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، اس میں یہ بھی تحریر تھا کہ

جہاں تک تمہاری ذات کا تعلق ہے تم سب کے لئے اپنے دروازے یکساں طور پر کھلے رکھو۔ ان کے کام خود سرانجام دو۔ مریضوں کی عیادت کرو۔ ان کے جنازوں میں شرکت کرو کیونکہ تم انہی میں کے ایک فرد ہو، اس فرق کے ساتھ کہ اللہ نے تم پر بہت بڑی ذمہ داری ڈال دی ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم اور تمہارے گھر والے ایسا کپڑا پہنتے، ایسا کھانا کھاتے اور ایسی سواریاں رکھتے ہیں، جو عام مسلمانوں کو میسر نہیں۔ خدا کے بندے! سچ کہیں تیرا حال اس جانور کا سا نہ ہو جائے جس کا گذر ایک شاداب وادی پر ہوا تو سوائے پُرخوری اور فربہی کے اس کے سامنے کوئی مقصد ہی نہ رہا، حالانکہ وہی پُرخوری اور فربہی اس کی ہلاکت کا موجب تھی۔ اچھی طرح یاد رکھو کہ حاکم کو خدا کے سامنے پیش ہونا ہے۔ جب حاکم بگڑتا ہے تو رعایا بھی بگڑ جاتی ہے۔ سب سے بدبخت وہ انسان ہے جس کی وجہ سے

اس کی رعیت بدبخت ہوجائے۔ (ص ۱۴۰)

حضرت سعد بن ابی وقاص رضؓ ہی کے لئے یہ ہدایات نہیں تھیں۔ آپ جب بھی کسی کو گورنر بنا کر بھیجتے تو فرماتے:۔

یاد رکھو! میں تم لوگوں کو مستبد اور ظالم بنا کر نہیں بھیج رہا بلکہ رعایا کا راہ نما (امام) بنا کر بھیج رہا ہوں۔ کبھی کسی بے قصور کو نہ مارنا کہ وہ ذلیل ہوجائے اور کبھی کسی کی بے جا تعریف نہ کرنا کہ وہ مچل جائے۔ لوگوں کے کام میں رکاوٹ پیدا کرنے کے بجائے سہولتیں مہیا کرنا۔

(۲) آپ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضؓ کو لکھا:۔

اپنی مجلس میں لوگوں کو مساوی درجہ دو۔ تاکہ کمزور آدمی تمہارے عدل سے ناامید نہ ہوجائے اور صاحبِ منصب اس سے ناجائز فائدہ نہ اٹھا سکیں۔

(۳) جب کسی حاکم کے متعلق سنتے کہ وہ مریضوں کی عیادت کے لئے نہیں جاتا اور صاحبِ احتیاج اس کے پاس آنے سے گھبراتے ہیں تو آپ اسے برخاست کر دیتے۔

(۴) حضرت ابوعبیدہ رضؓ بن جراح کے نام ایک خط میں لکھا:۔

یاد رکھو! لوگوں کے معاملات وہی سنوار سکتے ہیں جن کا عزم راسخ ہو اور وہ کسی سے دھوکا نہ کھائیں۔

نہ دھوکا دیتا ہے نہ دھوکا کھاتا ہے

ضمناً، ایک دفعہ ایک شخص نے کہا کہ مومن کسی کو دھوکا نہیں دیتا۔ آپ نے فرمایا کہ بات مکمل کرو۔ مومن نہ کسی کو دھوکا دیتا ہے، نہ دھوکا کھاتا ہے۔

(۵) ہر عامل سے عہد لیا جاتا ... کہ وہ (۱) ترکی گھوڑے پر سوار نہیں ہوگا (کہ اس میں رعونت اور نخوت پائی جاتی ہے)۔ (۲) باریک کپڑے نہیں پہنے گا۔ (۳) چھنا ہوا آٹا نہیں کھائے گا۔ (۴) اپنے دروازے پر دربان نہیں بٹھائے گا۔ (۵) اہلِ حاجت کے لئے اپنا دروازہ کھلا رکھے گا۔ یہ شرائط تقرری کے پروانے میں درج کر دی جاتی تھیں اور انہیں مجمع عام میں پڑھ کر بھی سنا دیا جاتا تھا۔

(۶) آپ نے ایک دفعہ اپنے عمّال کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:۔

یاد رکھو! رعیت اس وقت تک امام کی پیروی کرتی ہے جب تک وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے۔ جب وہ احکام خداوندی سے سرکشی برتتا ہے تو رعایا اس کے احکام سے سرکشی اختیار کر لیتی ہے۔ جب وہ فسق و فجور اختیار کر لیتا ہے تو رعایا اس سے بڑھ کر فاسق و فاجر ہوجاتی ہے۔

(۷) ایک دفعہ ایک شخص نے آپ کی اور حضرت عثمان رضؓ کی دعوت کی۔ جب وہاں سے واپس آئے تو آپ نے حضرت عثمان رضؓ سے کہا کہ کاش! میں یہ دعوت قبول نہ کرتا۔ انہوں نے پوچھا کہ کیوں؟

فرمایا۔ "مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہ دعوت اس لئے نہ کی گئی ہو کہ وہ لوگوں سے یہ کہے کہ دیکھو! میں کتنا بڑا آدمی ہوں جس کے گھر اتنے اتنے بڑے لوگ کھانے کے لئے آتے ہیں۔" اسی بنا پر وہ عمالِ حکومت کو بھی دعوتیں قبول کرنے سے روکا کرتے تھے۔

(۸) حضرت سعد بن ابی وقاص رضؓ کو ایک مراسلہ میں لکھتے ہیں کہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ کسی جھگڑے میں قبیلہ ضبّہ نے اپنے امیر کی طرف رجوع کرنے کے بجائے، آلِ ضبّہ (اپنے قبیلہ) کو مدد کے لئے پکارا تھا۔ یاد رکھو! جب کوئی شخص اپنے قبیلے کو آواز دے تو سمجھ لو کہ وہ شیطان کی آواز ہے۔

عصبیّتِ جاہلیہ کے خلاف

اس سے عہدِ جاہلیت کی قبائلی عصبیّت جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا، پھر سے بیدار ہو جائے گی۔ اس رجحان کو سختی سے روکو۔ اب، گروہ دو ہی ہوں گے۔ ظالم (زیادتی کرنے والا) اور مظلوم۔ اور مظلوم صرف امیر کو مدد کے لئے پکارے گا۔

(۹) حضرت عمرو بن عاص رضؓ کو ایک خط میں لکھا ــــ اور غور سے سنیئے کہ کیا لکھا ــــ لکھا کہ

تم اپنی رعایا کے لئے ایسے بن جاؤ جیسے تم اگر رعایا ہو تو چاہو کہ تمہارا امیر ایسا ہو۔ مجھے معلوم ہوا کہ تم مجلس میں تکیہ لگا کر بیٹھتے ہو۔ ایسا ہرگز نہ کرو۔ عام لوگوں کی طرح بیٹھا کرو۔

(۱۰) ایک اور قول سنیئے اور جھوم جایئے۔ فرمایا:۔

نرمی بلا ضعف۔ سختی بلا جبر

وہی حکومت درست رہ سکتی ہے جس میں نرمی ہو، لیکن کمزوری کی وجہ سے نہیں ــــ اور جس میں سختی ہو، لیکن استبداد کی بنا پر نہیں ــــ بلا ضعف نرمی، اور بلا جبر قوت ــــ یہ ہے اصل الاصول۔

ایک اور مقام پر فرمایا کہ "طاقتور خائن اور کمزور دیانتدار دونوں حکومت کے لئے نقصان رساں ہوتے ہیں۔"

(۱۱) حضرت مغیرہ رضؓ کو کوفہ کا گورنر بنایا تو کہا کہ

مغیرہ رضؓ ایسا بن کر رہنا کہ پرامن تجھ سے بے خوف رہیں، اور بدمعاش خوف زدہ۔

(۱۲) ایک اور وجد آفریں قول ــــ فرماتے ہیں:۔

وجد آفریں قول

جو شر پیدا کر کے غالب آیا، وہ غالب نہیں مغلوب ہے۔ جس نے ناجائز طریق سے کامیابی حاصل کی، وہ کامیاب نہیں، ناکام ہے۔

ایک دفعہ حضرت عمیر بن سعدؓ نے حمص میں منبر پر کھڑے ہو کر لوگوں سے کہا کہ

جب تک اسلام میں حکومت کا زور ہے وہ ناقابلِ شکست رہے گا۔ لیکن حکومت کے زور

کا مطلب تلوار سے قتل کرنا اور تازیانے مارنا نہیں بلکہ حق کے ساتھ فیصلہ اور انصاف کے ساتھ مؤاخذہ کرنا ہے۔

حضرت عمرؓ نے سنا تو فرمایا۔ اے کاش! عمیرؓ جیسا آدمی میرے قریب ہوتا تو میں اس سے مسلمانوں کے کتنے کام لیتا۔

(۱۳) ایک دفعہ عراق کا ایک وفد آیا جس میں حضرت احنف بن قیسؓ بھی تھے۔ سخت گرمی کا دن تھا۔ دیکھا کہ حضرت عمرؓ دھوپ میں کھڑے بیت المال کے ایک اونٹ کو تیل مل رہے ہیں اور اپنی عبا کو لپیٹ کر سر پر بطور عمامہ باندھ رکھا ہے۔ وفد کو دیکھا تو فرمایا:۔

احنف! کپڑے اتار کر آجا اور میری مدد کر۔ یہ بیت المال کا اونٹ ہے جس میں یتیموں بیواؤں اور مسکینوں کا حق ہے۔

ایک شخص نے کہا ـــــ امیر المؤمنین! آپ کسی غلام (خادم) سے کیوں نہیں کہتے کہ وہ یہ کام کر دے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھ سے اور احنف سے بڑا غلام کون ہوگا۔

اور اس کے بعد وہ انقلاب آفریں فقرہ ارشاد فرمایا جس کے لئے ہم نے اس واقعہ کو نقل کیا ہے ـــــ کہا:۔

غلام کی طرح مخلص اور امین

جو شخص مسلمانوں کا والی بنے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ غلام کی طرح مخلص اور امین رہے۔

(۱۴) ـــ عام تاکید یہ تھی کہ

گھر در سے بنو اور عجمیوں کی طرح ناز و انداز نہ کرو۔ اپنے آپ کو ان کے لباس سے بھی بچاؤ، کہ وہ تمہیں آرام طلب بنا دے گا۔ سخت بنو۔ جھوٹا موٹا کھاؤ، گاڑھا گزی پہنو۔ پرانے کپڑے استعمال کرو۔ سواریوں کو خوب فربہ کرو۔ ڈٹ کر گھڑ سواری کرو اور جم کر تیر اندازی کی مشق کرتے رہو۔ ہمیں تکلف سے منع کیا گیا ہے اس لئے کبھی تکلف نہ کرو۔ دین میں تفقہ حاصل کرو۔ کتاب کے ظرف اور علم کے سرچشمے بنو۔ سیادت و قیادت حاصل کرنے کی خواہش ہے تو پہلے سمجھ پیدا کرو۔ جس میں تکبر دیکھو سمجھ لو کہ وہ احساسِ کمتری کا شکار ہے۔

(۱۵) اور آخر میں وہ ہدایت، جس میں تمام ہدایات سمو جاتی ہیں۔ فرمایا:۔

محاسبۂ خویش

اپنا محاسبہ آپ کرو قبل اس کے کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے۔ کیونکہ محاسبۂ خویش تمہارے حساب کتاب کو آسان کر دے گا۔

اپنے آپ کا وزن کرتے رہو قبل اس کے کہ تمہارے لئے میزان کھڑی کی جائے۔ اپنے آپ کو "عرضِ اکبر" (عدالت کی بڑی پیشی) کے لئے تیار رکھو جس دن تمہاری کوئی بات بھی پوشیدہ نہیں رہے گی۔ (حوالہ۔ ص ۲۸۸ ـ ص ۲۹۱)

ایک دفعہ مصر کے حاکم حضرت فیاضؓ بن غنم کے متعلق شکایت پہنچی کہ وہ باریک کپڑے پہنتے ہیں اور انہوں نے

راعی کے فرائض

دروازے پر دربان مقرر کر رکھا ہے۔ حضرت عمرؓ نے انہیں ان کے عہدے سے معزول کیا۔ مدینے واپس بلا لیا اور ان سے کہا کہ

اپنی قمیض اتار کر کمبل کا جبہ پہنو۔ بکریوں کا ریوڑ لے کر جنگل کی طرف جاؤ اور بکریاں چراؤ اور ہر رہگذر کو پانی پلاؤ۔ اس سے تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ راعی کے فرائض کیا ہیں اور رعیت کے حقوق کیا! (ص ۲۲۴)

(ضمناً) راعی کے معنی ہی چرواہا ہیں۔ اس لفظ میں سربراہِ مملکت اسلامیہ کا صحیح مقام مضمر ہے۔

(۰)

عدل

اسلامی مملکت کے قیام اور وجود کی وجہ جواز ہی نظامِ عدل کا قیام ہے۔ عدل ایک بڑی جامع اصطلاح ہے جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر گوشے کو محیط ہے۔ ہم اس مقام پر صرف عدالتی عدل کی دو ایک مثالوں پر اکتفا کریں گے۔ مصر کے گورنر (حضرت عمروؓ بن عاص) کے بیٹے نے ایک قبطی کے بیٹے کو کسی بات پر تازیانوں سے پیٹا۔ وہ تازیانے مارتا جاتا تھا اور اس سے کہتا جاتا تھا کہ دیکھ! بڑوں کی اولاد ایسی ہوتی ہے۔ اس نے آکر حضرت عمرؓ سے شکایت کی تو آپ نے باپ بیٹے دونوں

عمرو بن عاصؓ کے بیٹے کا معاملہ

کو بلا بھیجا۔ اعترافِ جرم پر آپ نے اس قبطی سے کہا کہ جس طرح اس نے تمہیں تازیانوں سے پیٹا تھا، اسی طرح تم اس کے تازیانے لگاؤ۔ وہ اسے کوڑے مارتا جاتا تھا اور حضرت عمرؓ کہتے جاتے تھے کہ "مار ــــ بڑوں کی اولاد کو اور مار" جب وہ اُسے پیٹ چکا اور کوڑا حضرت عمرؓ کو واپس کرنے لگا تو آپ نے اس سے کہا کہ دو ایک کوڑے اس کے باپ (حضرت عمرو بن عاصؓ) کے بھی مارو کہ اگر اس نے اس کی صحیح تربیت کی ہوتی تو اس کے ذہن میں یہ خناس نہ سماتا کہ وہ بڑوں کی اولاد ہے۔ قبطی نے کہا کہ جس نے مجھے مارا تھا میں اس سے بدلہ لے چکا ہوں۔ میں انہیں پیٹنا نہیں چاہتا۔ آپ نے کوڑا اس سے لے لیا۔ سخت غضب آلود نگاہوں سے حضرت عمروؓ بن عاص کی طرف دیکھا اور وہ فقرہ کہا جو تکریمِ آدمیت اور شرفِ انسانیت کی تابندہ دلیل ہے۔ آپ نے فرمایا:۔

عمروؓ! تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنانا شروع کیا۔ ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا تھا۔

"ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا تھا" ــــ یہ ہے قرآن کریم کے اس ابدی اصول کی درخشندہ تشریح جس میں کہا گیا ہے کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰) ہم نے ہر انسان کو، اس کے انسان ہونے کی جہت سے واجب التکریم پیدا کیا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

اور خود اپنے خلاف!

حضرت عمرؓ نے ایک شخص سے پسند کی شرط پر گھوڑا خریدا اور امتحاناً اس پر سوار ہوئے۔ گھوڑا چوٹ کھا کر داغی ہو گیا۔ آپ نے اسے واپس کرنا چاہا۔ مالک نے انکار کر دیا۔ آپ نے کہا کہ اس معاملہ میں تصفیہ کے لئے کسی کو ثالث مقرر کر لو۔ اس نے کہا کہ میں شریحؒ کو ثالث ٹھہراتا ہوں۔ انہوں نے ماجرا سنا تو کہا کہ امیر المؤمنین! یا گھوڑا رکھ لیجئے اور یا جیسا وہ تھا ویسا اسے واپس کیجئے۔ آپ اس فیصلہ پر بہت خوش ہوئے اور شریحؒ سے کہا کہ آپ منصبِ قضاۃ کے لئے نہایت موزوں ہیں۔

اپنے خلاف فیصلہ

یہ ہیں تو وہ مشہور قاضی شریحؒ جنہوں نے ساٹھ برس تک اس فریضہ کو بکمال حسن و خوبی سر انجام دیا۔

اس سے بھی آگے بڑھئے۔ آپ ایک مقدمہ میں مدعی علیہ کی حیثیت سے حضرت زیدؓ بن ثابت کی عدالت میں پیش ہوئے۔ انہوں نے آپ کو تعظیماً بٹھانا چاہا تو آپ نے اُن سے کہا کہ زیدؓ! تم سے انصاف کی توقع کس طرح کی جا سکتی ہے جب تم نے ابتدا ہی میں، فریقین میں امتیاز کرنا شروع کر دیا ہے!! یہ کہہ کر مدعی کے قریب بیٹھ گئے۔ آپ کو دعویٰ سے انکار تھا۔ فریقِ مخالف (ابی بن کعب) نے آپ سے حلف لینے کو کہا۔ اس پر حضرت زیدؓ نے ان (مدعی) سے کہا کہ امیر المؤمنین سے قسم نہیں لینی چاہیئے۔ اس پر حضرت عمرؓ سخت برافروختہ ہوئے اور کہا کہ زیدؓ! تم منصبِ قضا کے اہل نہیں۔ جو قاضی کسی فریقِ مقدمہ کی پوزیشن کا خیال رکھتا ہو وہ انصاف نہیں کر سکتا۔ (حوالہ۔ صفحہ ۲۵۰)

حضرت عمرؓ عدالت میں

(۰)

تکریم انسانیت

اور یہ بات تکریمِ انسانیت کی ہو رہی تھی۔ یہ تکریم مسلمانوں تک محدود نہیں تھی۔ قرآن مجید نے ہر بنی آدم (انسان) کو واجب التکریم قرار دیا ہے۔ اس میں اپنے اور بیگانے، مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں۔ اس باب میں قرآنی تعلیم اور تربیتِ نبویؐ نے ان حضرات میں کیا تبدیلی پیدا کر دی تھی، اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے کہ ایک دفعہ حمص کے حاکم حضرت عمیرؓ بن سعد کی زبان سے ایک ذمی (غیر مسلم رعایا کے فرد) کے متعلق یہ الفاظ نکل گئے ـــ اخزاك الله ـــ خدا تجھے رسوا کرے۔ اس پر انہیں اس قدر ندامت اور تاسف ہوا کہ سیدھے بابِ خلافت میں پہنچے اور یہ کہہ کر حضرت عمرؓ کی خدمت میں اپنا استعفیٰ پیش کر دیا کہ میں نے ایک انسان کی تذلیل کی ہے۔ اس لئے میں اس منصب کا اہل نہیں ہوں۔ (صفحہ ۲۲۵)

مصر کے گورنر حضرت عمروؓ بن عاص نے ایک دفعہ ایک شخص کو منافق کہہ دیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اس

سے زیادہ اس کی ذلت اور کیا ہو سکتی ہے۔ ان سے کہا کہ اس شخص سے معافی مانگ کر اسے راضی کر لو ورنہ میں آپ کو سزا دے دوں گا۔ (ص ۳۲۴)

یہ تو احترام انسانیت کی بات ہوئی۔ دوسری طرف، ایک شخص آپ کی تعریف کرنے لگا۔ تو آپ نے فرمایا:۔

کیا تو مجھے اور اپنے آپ دونوں کو ہلاک کرنا چاہتا ہے؟ (ص ۳۲۴)

خدا کا عبد (بندہ) اپنے فرائض کی ادائیگی، کسی صلہ کی امید یا معاوضہ کی توقع پر نہیں کرتا۔ اس کا پہلا اعلان یہ ہوتا ہے کہ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَّلَا شُكُورًا۔ (۷۶/۹) "ہم تم سے، کسی قسم کے معاوضہ کے تو ایک طرف، شکریہ تک کے بھی متمنی نہیں"۔ اور ظاہر ہے کہ تعریف سے بڑھ کر صلہ کونسا ہو سکتا ہے۔

یہ ذہنیت (جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے) سربراہِ مملکت ہی کی نہیں تھی۔ اس نظام میں عام کارکنوں میں بھی یہ تبدیلی پیدا ہو چکی تھی۔ اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے۔ ایک جنگ میں، دشمن کا ایک سردار اس بے جگری اور جرأت و بسالت سے لڑتا تھا کہ اسے مغلوب کرنا مشکل نظر آتا تھا۔ مجاہدین کے سپہ سالار نے اعلان کیا کہ جو شخص اس سردار کا سر کاٹ کر لے آئے گا، اسے ہزار دینار انعام دیا جائے گا۔ صبح ہوئی تو لوگوں نے دیکھا کہ اس سردار کا سر سپہ سالار کے خیمے کے باہر پڑا ہے اور کسی کو پتہ نہیں کہ یہ کارنامہ کس نے سرانجام دیا ہے۔ لوگوں سے دریافت کرنے پر بھی کچھ معلوم نہ ہو سکا تو سپہ سالار نے اعلان کیا کہ جس مردِ حر نے یہ کارنامہ سرانجام دیا ہے میں اسے خدا کی قسم دیتا ہوں کہ وہ میرے سامنے آئے۔

یہ سن کر ایک غیر معروف سا سپاہی سامنے کھڑا ہو گیا۔ سپہ سالار نے پوچھا کہ یہ تمہارا کارنامہ ہے؟ اس نے کہا۔ ہاں! تو سپہ سالار نے کہا کہ یہ لو تمہارا انعام۔

اس نے انعام لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں نے یہ خدمت خدا کے لئے سرانجام دی ہے، انعام کی خاطر نہیں۔ سپہ سالار بہت خوش ہوا۔ اس سے پوچھا کہ تمہارا نام کیا ہے؟ وہ بولا ــــ آپ میرا نام پوچھ کر کیا کریں گے۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ لوگوں میں اس کا شہرہ کر دیں۔ تم اس طرح میرا اجر بھی ضائع کر دو گے اور میرے نفس کو بھی خراب کر دو گے۔ مجھے جانے دیجئے۔ (حوالہ ص ۱۲۸)

کامیابی کا راز

یہی وہ حسنِ کردار تھا جس میں مومنین کی اس کامیابی کا راز تھا، جسے (اپنے تو ایک طرف) غیر بھی میر الفقول اور عدیم النظیر قرار دیتے ہیں۔ اسی حقیقت کا حضرت عمرؓ نے، حضرت سعدؓ بن وقاص کے نام ایک گرامی نامہ میں یوں اظہار فرمایا تھا۔

میں تمہیں اور تمہارے لشکریوں کو حکم دیتا ہوں کہ وہ ہر حال میں اللہ سے ڈرتے رہیں کیونکہ دشمن کے مقابلہ کے لئے سب سے زیادہ مؤثر ہتھیار اور سب سے زیادہ کامیاب تدبیر، خوفِ خدا ہے ــــ خوفِ خدا کے معنی ہیں، احکامِ خداوندی کی خلاف ورزی سے بچنا۔ میں تم سب کو حکم دیتا ہوں کہ تم اپنے دشمن کی نسبت، اخلاقی خرابیوں سے زیادہ بچو کیونکہ اہلِ لشکر کی اپنی اخلاقی خرابیاں

ان کے حق میں دشمنوں کے حملوں سے بھی زیادہ خطرناک ہوتی ہیں۔ مسلمانوں کی فتح صرف اس لئے ہوتا ہے کہ دشمن کے اخلاق ان سے زیادہ پست ہوتے ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہو تو مسلمان کبھی ان کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ اس لئے کہ نہ ہماری فوج، تعداد میں ان کی فوج کے برابر ہے نہ ساز و سامان میں۔ لہٰذا اگر گنہگاری بھی بد اخلاقی اور بد کرداری میں ہم ان سے ایک سطح پر ہوئے تو پھر وہ کونسی چیز ہو گی جس کے بل بوتے پر ہم ان پر غالب آسکیں گے۔ اگر ہم حسن سیرت میں ان سے آگے ہوں گے تو ہم ان پر فتح حاصل کر سکیں گے تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ تمہارے اوپر کراماً کاتبین مقرر ہیں جو تمہاری ہر بات کو جانتے ہیں۔ ان سے شرماؤ (اور اس طرح ظاہر و باطن ہر بد اخلاقی اور معصیت سے بچو) یہ کبھی خیال نہ کرو کہ ہم بُرے ہی سہی، لیکن دشمن ہم سے زیادہ بُرا ہے اس لئے خدا یہ کبھی نہیں کرے گا کہ خواہ ہم برائی ہی کیوں نہ کرتے رہیں، وہ ہم پر مسلّط ہو جائے۔ تاریخ میں دیکھو۔ کتنی قومیں ایسی تھیں کہ ان سے زیادہ بُری قومیں ان پر مسلّط ہو گئیں۔ بابل کا بخت نصر بنی اسرائیل پر کس طرح مسلّط ہو گیا حالانکہ بنی اسرائیل بہرحال خدا کو مانتے تھے اور اہلِ بابل کافر و مشرک تھے۔ (لہٰذا، اپنا اور دشمن کا مقابلہ برائیوں کے پیمانے سے نہیں، اچھائیوں کے پیمانے سے کرو۔ اسی میں کامیابی کا راز ہے)۔ (صفحہ ۱۲۸)

معاشی نظام

روٹی کا مسئلہ انسان کی زندگی کا مسئلہ ہے۔ یہ روزِ اوّل سے آج تک اس کے ساتھ لگا چلا آرہا ہے، اور لگا چلا جائے گا۔ قرآن نے کہا ہے کہ ایک نظامِ معاشرہ وہ ہے جس میں روٹی کا مسئلہ ہی مقصدِ حیات بن کر رہ جاتا ہے، اور ہر شخص کھانے پینے کی پریشانیوں میں سر کھپاتا ہوا دنیا سے چل بستا ہے۔ قرآن کے نزدیک یہ حیوانی سطحِ زندگی ہے۔ اسے وہ کفر سے تعبیر کرتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ (۴۷/۱۲)

کفر یہ ہے کہ انسان حیوانات کی طرح محض کھانے پینے کو مقصودِ حیات قرار دے لے۔ انہی الجھنوں میں الجھا رہے۔ اس زندگی کا مآل جہنّم ہے۔

دوسرا نظام یہ ہے کہ افرادِ معاشرہ، کھانے پینے (سامانِ زیست) کی فکر سے آزاد اور فارغ ہوں اور اپنی صلاحیتوں کو ارتقاء اور فروغِ انسانیت کے لئے وقف کر دیں۔ یہ اسلامی نظام ہے اور اس کا مآل جنّت کی زندگی ۔۔۔ اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

اسلامی نظام، تمام افرادِ معاشرہ کو سامانِ زیست بہم پہنچانے کی ذمہ داری اپنے سر پر لے لیتا ہے اور ان سے کہہ دیتا ہے کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ۔ (۶/۱۵۲) "ہم تمہاری ضروریاتِ زندگی کے

بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کی ضروریاتِ زندگی کے بھی"۔ جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے، اس نظام کی ابتداء عہدِ نبویؐ میں ہوئی تھی لیکن یہ تکمیل تک عہدِ فاروقیؓ میں پہنچا تھا۔ اس کی شہادت آپ کا یہ اعلان بہم پہنچاتا ہے کہ

لو مات کلب علی شاطی الفرات جوعاً۔ لکان عمر مسئولاً عنہ یوم القیٰمۃ (ص ۳۶۹)

اگر فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر گیا، تو قیامت کے دن عمرؓ سے اس کی بھی بازپرس ہوگی۔

آپ نے اس ذمہ داری میں، افرادِ معاشرہ کے ساتھ معاشرتی جانوروں کو بھی شامل کر لیا ہے۔ اس کا انتظام کس طرح کیا گیا تھا، یہ گوشہ ہمارے پیشِ نظر موضوع سے خارج ہے (اس کے متعلق طلوعِ اسلام میں بکثرت لکھا جا چکا ہے، اور پرویز صاحب کی کتاب۔ نظامِ ربوبیت ــــ میں اس پر تفصیلی بحث کی گئی ہے) سرِدست ہم یہی بتائیں گے کہ حضرت عمرؓ کو اپنی اس ذمہ داری کا کس قدر شدید احساس تھا۔

آپ کے زمانے میں مملکت بڑی وسیع ہو گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی (ظاہر ہے کہ) خبررسانی کا نظام بھی پھیل گیا تھا لیکن لوگوں کی ضروریات پورا کرنے کی ذمہ داری کا احساس اس قدر شدید تھا کہ آپ ذرائعِ خبررسانی پر ہی انحصار نہیں کرتے تھے بلکہ (جہاں تک ممکن تھا) خود (براہِ راست) بھی لوگوں کے حالات معلوم کرتے رہتے تھے۔ اس کے لئے آپ (دن بھر امورِ مملکت کی سرانجام دہی سے عہدہ برآ ہونے کے بعد) راتوں کی تنہائیوں میں گشت بھی کیا کرتے تھے۔ اس گشت کے بہت سے واقعات تاریخ میں مذکور ہیں۔ ہم ان میں سے دو چار کا ذکر کرتے ہیں۔

(۱) ایک دفعہ ایک قافلہ آیا اور شہر سے باہر اُترا۔ اس کی خبرگیری کے لئے خود تشریف لے گئے۔ گشت لگاتے پھر رہے تھے کہ ایک طرف سے ایک شیرخوار بچے کے رونے کی آواز آئی۔ اُدھر گئے اور اس کی ماں کو تاکید کی کہ وہ بچے کو بہلائے۔ تھوڑی دیر بعد پھر اُدھر سے گزرے تو بچے کو روتے پایا۔ سخت

بچہ رو رہا تھا

غصّے کے عالم میں اس کی ماں سے کہا کہ تم بڑی بے رحم ہو۔ اس نے کہا کہ راہرو! تمہیں حقیقت کا علم نہیں اور مجھے خواہ مخواہ تنگ کرتے ہو۔ بات یہ ہے کہ عمرؓ نے حکم دے رکھا ہے کہ بچوں کا وظیفہ اس وقت سے شروع کیا جائے جب وہ دودھ چھوڑ دیں۔ میں اس کا دودھ چھڑاتی ہوں اور یہ روتا ہے۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ کو سخت رِقت ہوئی اور کہا کہ ہائے عمرؓ! معلوم تو نے کتنے بچوں کا خون کیا ہوگا۔ اُسی دن منادی کرادی کہ بچوں کی پیدائش کے ساتھ ہی ان کا وظیفہ مقرر کر دیا جائے۔ (صفحہ ۳۰)

(۲) ایک دفعہ آپ گشت کو نکلے۔ شہر سے باہر ایک مقام پر دیکھا کہ ایک عورت کچھ پکا رہی ہے اور دو تین بچے رو رہے ہیں۔ حقیقتِ حال معلوم کرنے پر اس نے کہا کہ تین وقت سے بچوں کو کچھ کھانے کو نہیں ملا۔ میں نے خالی ہنڈیا چڑھا رکھی ہے کہ بچوں کا دل بہلا رہے۔ آپ نے اس سے کہا کہ تم نے امیرالمؤمنین کو اس کی اطلاع دی ہے۔ اس کے جواب میں اس نے جو کچھ کہا اس سے اندازہ لگ سکتا ہے کہ اس دور میں

عام عورتوں تک حکومت کی ذمہ داریوں کو کس حد تک جانتی تھیں۔ اس نے کہا تھا کہ

جو شخص حاکم ہو کر رعایا کے حالات سے بے خبر ہے اس تک شکایت پہنچانے سے کیا حاصل!

سوچئے کہ اس سے عمر فاروقؓ کے دل پر کیا گزری ہو گی! آپ اُٹھے۔ بیت المال سے آٹا، گھی، کھجوریں لیں اور اسلم سے کہا کہ انہیں میری پیٹھ پر لاد دو۔ اسلم نے کہا کہ مجھے دیجئے۔ میں لئے جاتا ہوں۔ فرمایا کہ اسلم! اس معاملہ کا تعلق قیامت سے ہے اور قیامت میں تم میرا بوجھ نہیں اٹھاؤ گے۔ اس لئے یہ بوجھ مجھے خود ہی اٹھانے دو۔ یہ چیزیں لا کر اس عورت کو دیں۔ اس نے ہانڈی چڑھائی تو آپ چولہا پھونکتے رہے۔ کھانا تیار ہوا۔ بچوں نے سیر ہو کر کھایا اور اچھلنے کودنے لگے۔ حضرت عمرؓ انہیں دیکھ کر بہت خوش ہو رہے تھے۔ چلنے لگے تو اس عورت نے کہا کہ خدا تمہیں جزائے خیر دے۔ امیر المؤمنین ہونے کے قابل تم تھے نہ کہ عمرؓ۔ فی الحقیقت امیر المؤمنین ہونے کے قابل یہی تھے۔ (صفحہ ۳۱)

حیرت ہے کہ ایک شخص دن بھر، بائیس لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی مملکت کے جملہ امور سرانجام دیتا اور پھر راتوں کو اس طرح گشت بھی کرتا ہے، تو وہ سوتا کس وقت تھا؟

سونے کی بات آئی تو یہ بھی سن لیجئے۔ ایک دفعہ مصر کے قاصد، حضرت معاویہؓ بن حدیج ملنے کے لئے آئے تو وہ دانستہ دن ڈھلے ملاقات کے لئے پہنچے۔ آپ کو معلوم ہوا تو کہا کہ تم نے خیال کیا ہو گا کہ دوپہر کے وقت امیر المؤمنین قیلولہ فرما رہے ہوں گے اس لئے تم دیر سے آئے۔ فرمایا۔ معاویہؓ! جس کے ذمے مملکت کے فرائض ہوں، دن تو ایک طرف، اسے رات کے وقت بھی نیند نہیں آسکتی۔ (صفحہ ۲۹)

اس ضمنی تذکرہ کے بعد، پھر گشت کے واقعات کی طرف آئیے۔

(۴) اور یہیں سے ہمارے سامنے وہ واقعہ آ جاتا ہے کہ جب بھی عمرؓ اسے یاد کرتے، آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔ آپ شام کے سفر سے واپس آ رہے تھے تو راستے میں ایک خیمہ دیکھا — ویرانے میں ایک خیمہ!

شام کے ویرانے کی بڑھیا

قریب گئے تو دیکھا کہ اس میں ایک بڑھیا بیٹھی ہے۔ پوچھا کہ تمہیں عمرؓ کا بھی کچھ حال معلوم ہے۔ اس نے کہا کہ سنا ہے کہ وہ شام سے چل پڑا ہے۔ اس سے زیادہ نہ مجھے اس کی بابت کچھ علم ہے، نہ معلوم کرنے کی ضرورت۔ آپ نے پوچھا کہ ایسا کیوں؟ اس نے کہا کہ جس نے آج تک یہ معلوم نہیں کیا کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے، میں اس کے حالات معلوم کر کے کیا کروں گی؟ — آپ نے کہا کہ تم نے عمرؓ تک اپنی حالت کی اطلاع پہنچائی تھی! اس نے کہا کہ یہ میرا کام نہیں تھا، عمرؓ کا کام تھا — آپ نے کہا کہ عمرؓ کو اتنی دور کا حال کیسے معلوم ہو سکتا ہے! اس کے جواب میں اس بڑھیا نے جو کچھ کہا وہ عزت سے سننے کے قابل ہے۔ اس نے کہا کہ

اگر عمرؓ اپنی رعایا کے ہر فرد کے حالات کا علم نہیں رکھتا تو اسے حکومت کرنے کا کیا حق حاصل ہے۔

حضرت عمرؓ جب بھی اس واقعہ کو یاد کرتے تو آنکھوں میں آنسو آ جاتے اور کہتے کہ خلافت کا مفہوم کیا ہے، مجھے شام کی بڑھیا نے بتایا۔

خداوندا! خدائی درد سر ہے۔

اسی کا احساس تھا کہ آپ نے ایک دفعہ فرمایا کہ

اگر میں زندہ رہا تو رعایا کا حال معلوم کرنے کے لئے سال بھر تک مسلسل سفر میں رہوں گا کیونکہ دور دراز علاقوں کے لوگ مجھ تک پہنچ نہیں سکتے۔ اور میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے عمال، ان میں سے ہر ایک کی ضروریات سے مجھے آگاہ کرتے ہوں۔ میں شام، جزیرہ، مصر، بحرین، بصرہ، جاؤں گا اور ہر مقام پر دو دو ماہ قیام کر کے لوگوں کے حالات براہ راست معلوم کروں گا۔

لیکن عمرؓ نے ایفائے کی اور۔ اس دورہ کا موقعہ ہی نہ ملا۔ (صـ۳۰۳)

آپ یہ دورہ تو نہ کر سکے لیکن یہ مستقل حکم نافذ تھا کہ

قلمروِ خلافت میں بلا تخصیص مذہب و ملت، ہر تنگدست کی امداد کی جائے۔ ہر مقروض کا قرض ادا کیا جائے۔ ہر کمزور، ضعیف اور مظلوم کی اعانت کی جائے۔ ہر ظالم کو ظلم سے روکا جائے۔ ہر ننگے کو کپڑا پہنایا جائے۔ (صـ۲۶۵)

اور اس کی نگرانی خود کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایک قاصد (قیس اشجعی) آپ کے پاس آیا۔ اس کا بیان ہے کہ میں آیا تو آپ لکڑی کی ٹیک لگائے اس طرح کھڑے تھے جس طرح چرواہا اپنے ریوڑ کے پاس کھڑا ہوتا ہے۔ آپ لوگوں کو کھانا کھلوا رہے تھے۔ آپ چکر لگاتے جاتے اور فرماتے جاتے، اے یرفا! اسے گوشت دے۔ اسے روٹی دے۔ اسے شوربا دے۔ (صـ۳۶۵)

اور یہ کچھ خیرات کی طرح نہیں دیا جاتا تھا۔ خیرات کے متعلق تو حضورؐ نے فرمایا ہے کہ: الصدقة تميت القلب۔ "صدقہ اور خیرات، انسان کے دل کی موت ہے"۔ صدقہ اور خیرات کے ذریعے حاجتمندوں کی ضروریات اس زمانے میں پوری کی جاتی تھیں۔ جب ہنوز یہ نظام قائم نہیں ہوا تھا۔ اس وقت اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ اس نظام کے قیام کے بعد تو ارباب اقتدار اسے اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے اور ضرورت مند اسے اپنا حق۔ اس حق کی ادائیگی میں بھی احترام انسانیت کو ملحوظ رکھا جاتا تھا۔

احترام انسانیت

حضرت اسلم کی روایت ہے کہ ایک دن میں حضرت عمرؓ کے ساتھ بازار گیا تو وہاں ایک نوجوان عورت آپ سے ملی اور کہنے لگی کہ امیر المؤمنین! میرا شوہر مر گیا اور چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ گیا ہے۔ ان کے لئے کھانے پینے کا کوئی سامان نہیں۔ میں خفاف بن ایماء الغفاری کی بیٹی ہوں جو حدیبیہ میں رسول اللہؐ کے ساتھ تھے۔ آپ اس کی باتیں خاموشی سے سنتے رہے۔ گھر آئے اور ایک تنومند و توانا اونٹ پر سامانِ رسد اور دیگر اشیائے ضروریہ لاد کر اس کے پاس لے گئے اور کہا کہ بیٹی! اسے ہنکا لے جا۔ اب تجھے خود آنے کی ضرورت نہیں پڑے گی تمام ضروری سامان تم تک خود بخود پہنچ جایا کرے گا۔ ایک شخص نے دیکھا تو کہا۔ امیر المومنین! آپ نے اس لڑکی کو بہت زیادہ دے دیا۔ فرمایا کہ تجھے کیا خبر کہ وہ کس باپ کی بیٹی اور کس بھائی کی بہن ہے؟ یہ میں جانتا ہوں۔ (صـ۳۶۶)

ایک دفعہ آپ کسی دعوت میں گئے تو دیکھا کہ اہلِ خانہ کے ملازم دستر خوان پر موجود نہیں۔ دریافت

کرنے پر صاحب خانہ نے کہا کہ ہم پہلے کھاتے ہیں۔ وہ بعد میں کھا لیتے ہیں۔ آپ نے اس پر برافروختہ ہو کر فرمایا:۔

خدایا! اس قوم کا کیا حشر ہوگا جو اپنے آپ کو اپنے ملازموں پر ترجیح دیتی ہے۔

پھر آپ نے ان ملازموں کو بلایا۔ پہلے انہیں کھلایا اور بعد میں خود کھایا۔ (ص ۲۶۶)

ایک نہایت اہم فیصلہ

معلوم ہوتا ہے کہ کچھ وقت تک۔ انتظام یہی تھا کہ ملازموں کے کھانے پینے کی ذمہ داری ان کے مالکوں پر تھی۔ لیکن اس میں ایک سقم نظر آیا۔ یہ سقم حاطم ابن ابی بلتعہ کے غلاموں (ملازموں) کے واقعہ میں سامنے آیا جو جرم و سزا کے فلسفہ کے سلسلہ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ہوا یوں کہ ان کے ملازموں نے ایک شخص کا اونٹ چرا کر، ذبح کر کے کھا لیا۔ ان کے خلاف، چوری کا جرم ثابت ہو گیا۔ آپ نے حد

بھوکوں کی چوری

(سزا) نافذ کرنے سے پہلے ان سے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ انہوں نے کہا کہ حاطب ہم سے سخت کام لیتا ہے لیکن کھانے کو اس قدر کم دیتا ہے کہ اس سے ہمارا پیٹ نہیں بھرتا۔ ہم نے انتہائی مجبوری کے عالم میں ایسا کیا ہے۔

یہ سن کر آپ نے غلاموں کو تو معاف کر دیا اور حاطب کو بلا کر کہا کہ چاہیئے تو یہ کہ چوری کے جرم کی سزا میں تمہارا ہاتھ کٹوا دیا جائے کہ اس جرم کے مرتکب تمہارے غلام نہیں، تم ہو جس نے انہیں اس حالت تک پہنچا دیا کہ وہ چوری کرنے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن میں تم سے نرمی برتتا ہوں۔ اس دفعہ تو اتنی سزا ہی کافی سمجھتا ہوں کہ تم اونٹ کی قیمت اس کے مالک کو ادا کر دو۔ اگر آئندہ تمہارے غلاموں کی یہی حالت ہو گئی تو پھر تمہارے لئے کسی سخت سزا کا سوچا جائے گا۔ (ص ۲۴۵)

اس فیصلہ سے جرم و سزا کے معاملہ میں بڑے دور رس نتائج مستنبط ہوتے ہیں۔ یعنی یہ سزائیں اس وقت دی جا سکتی ہیں جب ہر فرد معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی پوری ہو رہی ہوں۔ اس کے لئے آپ نے تمام افرادِ معاشرہ کے وظائف مقرر کر دیئے۔ خوراک ہر ایک کو بیت المال کے مودی خانہ سے ملتی تھی۔ یہ طے کرنے کے لئے کہ فی کس کس قدر خوراک دی جائے، آپ نے (اپنے معمول کے مطابق) عملی طریق اختیار فرمایا۔ آپ نے ایک جریب آٹا پکوا کر لوگوں کو اپنے سامنے کھلایا۔ اس سے تیس آدمی سیر ہو گئے۔ پھر

خوراک کا معیار

اسی طرح شام کو پکوا کر کھلایا۔ اور جب اطمینان کر لیا کہ اتنا آٹا کافی ہوتا ہے تو اس کے مطابق ہر ایک کا راشن مقرر کر دیا۔ اسی کے مطابق آپ نے اپنے عمال کو بھی ہدایات بھیجیں۔ اور اس کے ساتھ ہی تاکید کر دی کہ "لوگوں کی خوراک ان کے گھروں پر پہنچاؤ۔ اور اتنا دو جس سے ان کا اور ان کے بچوں کا خوب گزارہ ہو جائے۔ یاد رکھو! مٹھی مٹھی دینے سے لوگوں کے اخلاق درست نہیں ہو سکتے ــــ اخلاق کا معاش سے کس قدر گہرا تعلق ہے، اس کا اندازہ

حضرت عمرؓ کی ہدایات کے آخری الفاظ سے لگ سکتا ہے۔ (ص ۳۹۸)

اور جب یہ تمام انتظامات اطمینان بخش طریق سے مکمل ہو گئے تو
آپ نے مال جمع کرنے سے روک دیا اور مسلمانوں پر اراضی بطورِ جائیداد رکھنا اور اپنے طور پر کاشتکاری کرنا یا کرانا حرام قرار دے دیا۔ کیونکہ ان کے اور ان کے اہل و عیال کے معاش کا بندوبست بیت المال سے کر دیا گیا تھا۔

(جوہری طنطاوی۔ بحوالہ نظام العالم و الامم۔ جلد دوم۔ شاہکارِ رسالت ص ۳۹۹)

اس طرح خدا کے ان احکام کی تعمیل ہو گئی کہ مال و دولت جمع کرنا اور زمین پر ذاتی ملکیت رکھنا جائز نہیں۔

--(۰)--

حسبنا کتاب اللہ

سوال یہ ہے کہ اس قدر عظیم انقلاب جس کی نظیر آسمان کی آنکھ نے نہیں دیکھی تھی اور افرادِ معاشرہ کی سیرت و کردار میں ایسی محیر العقول تبدیلی رونما کیسے ہو گئی؟ اس کا جواب حضرت عمرؓ کے ان دو الفاظ میں آجاتا ہے جو انہوں نے نبی اکرمؐ کی حیاتِ ارضی کے آخری لمحات میں اس وقت ارشاد فرمائے تھے جب عام احساس یہ تھا کہ آپؐ کی وفات کے بعد کیا ہو گا۔ ہمیں کہاں سے راہ نمائی ملے گی۔ آپ نے فرمایا تھا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔

حسبنا کتاب اللہ!

خدا کی کتاب ہمارے لئے کافی ہے۔ (ص ۶۵)

یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی صدائے بازگشت تھی جس میں فرمایا گیا تھا کہ

اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ..... (۲۹/۵۱)

کیا ان لوگوں کے لئے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تیری طرف یہ کتاب نازل کی ہے جسے ان کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

اور حضورؐ کے اس ارشادِ گرامی کی تعبیر جسے آپؐ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں، ایک لاکھ بیس ہزار کے مجمع میں بدیں الفاظ ارشاد فرمایا تھا کہ

قد ترکت فیکم ما تضلوا بعدہ ان اعتصمتم بہ کتاب اللہ۔

(بخاری۔ باب حجۃ الوداع)

میں تم میں ایک ایسی چیز چھوڑ چلا ہوں کہ اگر تم میرے بعد اس کے ساتھ متمسک رہے تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔ (ص ۶۵)

حضرت عمرؓ اس کتاب کے ساتھ خود بھی متمسک رہے اور قوم کو بھی اسی کے مطابق چلایا۔ آپ ہمیشہ دعا کیا کرتے تھے کہ

یا اللہ! مجھے تفکّر و تدبّرِ قرآنی عطا فرما، تاکہ میں جو کچھ قرآن سے پڑھوں اسے اچھی طرح سمجھ سکوں۔ اور اس کے نوادرات پر غور کر سکوں۔ (ص ۶۶)

اور اپنے رفقاء سے کہا کرتے تھے کہ

قرآن پڑھا کرو، اسی سے تمہاری قدر و منزلت ہوگی۔ اور اسی پر عمل کرو تاکہ تم، حاملِ قرآن بن جاؤ۔ (ص ۶۶)

وہ امورِ مملکت میں اپنے مشیروں سے مشورہ لیتے تو ان سے واضح الفاظ میں کہہ دیتے کہ میں یہ نہیں چاہتا کہ تم میری بات مانو۔ آپ لوگوں کے پاس کتاب اللہ ہے جو حق کو صاف صاف بیان کرتی ہے۔ تم مجھے اس کے مطابق مشورہ دو۔ (ص ۶۶) وہ قرآن میں تفقہ (غور و فکر) پر بہت زور دیتے تھے چنانچہ آپ نے ایک مرتبہ اپنے گورنروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ "میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ زمانہ قریب آ رہا ہے جب قرآن کے قاری تو بہت ہوں گے لیکن اس پر غور و فکر کرنے والے بہت کم ہوں گے۔" (ص ۶۷) وہ عمال کے انتخاب میں اس خصوصیت پر بڑا زور دیتے تھے کہ ان کی قرآن پر گہری نگاہ ہو۔ (ص ۲۸۴) معاملات کے فیصلہ کرنے میں وہ سند قرآنِ کریم کو قرار دیتے تھے نہ کہ اپنی رائے کو۔

آپ نے ایک دفعہ کسی معاملہ میں رائے دی تو کسی نے کہا کہ یہ "اللہ اور عمرؓ کی رائے ہے"۔ آپ نے اسے فوراً ڈانٹا اور فرمایا کہ "تو نے یہ بہت بڑی بات کہی ہے۔ یہ صرف عمرؓ کی رائے ہے۔ اگر درست ہے تو اللہ کی طرف سے ہے، اور غلط ہے تو عمرؓ کی طرف سے۔" اس کے بعد تھوڑی دیر کے لئے خاموش رہے۔ اور پھر فرمایا کہ "یاد رکھو! رائے غلط بھی ہو سکتی ہے۔ اسے امت کے لئے سنّت نہ بناؤ۔" اس باب میں وہ اس قدر محتاط تھے کہ اپنی زندگی کے آخری سانس میں، جب جسم سے اس قدر خون بہ رہا تھا اور آپ درد کی شدّت سے نڈھال تھے، آپ نے اپنے بیٹے (حضرت عبداللہ بن عمرؓ) سے کہا کہ "وہ ہڈی لاؤ ــــ جس پر میں نے دادا کے حصّہ کے متعلق کچھ لکھا تھا۔" اس سے مقصد یہ تھا کہ اس تحریر کو مٹا دیا جائے۔ بیٹے نے کہا کہ آپ اس وقت سخت تکلیف میں ہیں۔ یہ کام، آپ کی طرف سے ہم بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن آپ نے سختی سے کہا کہ تم اس کی اہمیت اور میری ذمہ داری کو نہیں سمجھتے۔ جاؤ۔ وہ ہڈی لاؤ۔ چنانچہ آپ اطمینان سے نہ بیٹھے جبتک وہ ہڈی نہ آ گئی۔ اور آپ نے اپنی تحریر کو اپنے ہاتھوں سے نہ مٹا ڈالا ــــ احتیاط یہ تھی کہ عمرؓ کی رائے بعد میں آنے والوں کے لئے سند نہ بن جائے۔ (ص ۲۷۵)

وصیّت

قرآنِ کریم کی اہمیت و عظمت آپ کے رگ و پے میں اس شدّت سے سرایت کئے ہوئے تھی کہ

جب آپ کو وہ زخم لگا ہے جس سے آپ کی شہادت واقعہ ہوگئی تھی کیفیت یہ تھی کہ آپ کی انتڑیاں کٹ کر باہر آچکی تھیں۔ جسم سے خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ درد کی شدت انتہا تک پہنچ چکی تھی۔ نقاہت بڑھتی جا رہی تھی۔ اس حالت میں صحابہؓ آپ کے گرد جمع ہوئے اور آپ سے کہا کہ آپ اپنی وصیت فرما دیجئے۔ تو آپ نے ان سے کہا کہ

> میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ کتاب اللہ کو تھامے رہنا کیونکہ جب تم اسے تھامے رہو گے گمراہ نہیں ہو گے۔

اسی حالت میں ایک شخص آپ کی عیادت کے لئے آیا۔ اس نے دیکھا کہ آپ آخرت کے خیال سے مضطرب و بے قرار ہیں۔ اور بار بار اس کا احساس کرتے ہیں کہ جو ذمہ داریاں خدا نے مجھے سونپی تھیں، معلوم نہیں میں ان سے عہدہ برآ ہو سکا ہوں یا نہیں۔ اس نے کہا کہ آپ اس میں متردد نہ ہوں جہنم کی آگ آپ کے جسم کو مس تک نہ کر سکے گی۔ آپ نے اس کی طرف دیکھا۔ آپ کی آنکھوں سے آنسو چھلک رہے تھے۔ اور کہا کہ بھائی تمہارا علم اس معاملہ میں بہت قلیل ہے۔ میرے بس میں ہوتا تو میں زمین کے سارے خزانے اس مؤاخذہ کے خوف پر نچھاور کر دیتا۔ آپ نے یہ آخری الفاظ کہے تو حضرت ابن عباسؓ نے، جو پاس بیٹھے تھے کہا کہ یہ شخص ٹھیک کہتا ہے۔ اس لئے کہ آپ ہمیشہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرتے تھے اور سب کے حصے برابر برابر تقسیم کرتے تھے۔ یہ سن کر آپ کی نگاہوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ سنبھل کر بیٹھ گئے اور کہا کہ ابن عباسؓ! کیا تم میرے لئے خدا کے ہاں اس کی شہادت دو گے؟ وہ خاموش ہو گئے تو آپ نے ان کے شانے پر ہاتھ مارا اور دوبارہ کہا کہو! ابن عباسؓ! تم اس کی شہادت دو گے کہ میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کیا کرتا تھا اور سب کے حصے برابر تقسیم کیا کرتا تھا۔ حضرت ابن عباسؓ نے کہا کہ ہاں! میں اس کی گواہی دوں گا۔ اس پر آپ کو اطمینان ہوا۔ (ص ۲۴۱-۲۴۲)

لیکن ان شہادات کے باوجود آپ پر اپنی ذمہ داریوں کے محاسبہ کا احساس شدید تر ہوتا جا رہا تھا۔ روایت ہے کہ انہوں نے ایک تنکا اٹھایا اور کہا کہ اے کاش! میں عمرؓ ہونے کے بجائے یہ تنکا ہوتا تو ذمہ داریوں کے بوجھ سے چھوٹ جاتا۔ پھر فرمایا کہ تم لوگ میری تعریف کرتے ہو اور جنت کی بشارت دیتے ہو اور مجھے یہ خوف ستا رہا ہے کہ

> اگر عمرؓ نے کسی کمزور پر ظلم کیا ہو گا اور اس کی فریاد آسمان پر پہنچی ہو گی تو اس کی ساری کی ساری نیکیاں صاحبِ عرش کے حضور بے وزن ہو جائیں گی۔ (ص ۲۲۳)

کسی کمزور پر ظلم کرنے سے ساری عمر کی نیکیاں رائیگاں چلی جائیں گی! یہ تھا وہ ایمان جس نے ابنِ خطابؓ کو فاروقِ اعظمؓ بنا دیا تھا۔

(۰)

قانون سازی

سابقہ صفحات میں ہم نے "فاروقیت" کو پاکیزگیٔ سیرت اور بلندیٔ کردار

تک محدود رکھا ہے، کہ اس کے بغیر نہ معاشرہ میں کوئی اصلاح ہو سکتی ہے، نہ ہی اسلامی نظام یا اسلامی مملکت کا قیام عمل میں آسکتا ہے۔ اس کے بغیر اصلاحِ احوال کی کوشش خدا کو چیلنج دینے کے مترادف ہے۔ اس لئے کہا ہے کہ

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ ..... (۱۳/۱۱)

تم تو ایک طرف رہے خود خدا بھی کسی قوم کے حالات میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا جب تک وہ قوم خود اپنے اندر (نفسیاتی) تبدیلی پیدا نہ کر لے

لہٰذا، تغیرِ نفس (سیرت و کردار) کی تبدیلی کے بغیر اصلاحِ معاشرہ کی کوشش کے یہ معنی ہیں کہ ہم (معاذ اللہ) خدا سے یہ کہتے ہیں کہ آپ کا دعویٰ ہے کہ تغیرِ نفس سے بغیر، تغیرِ احوال ناممکن ہے۔ ہم ایسا کر کے دکھا دیں گے! اس کا جو نتیجہ ہوگا ظاہر ہے۔ یہ وجہ ہے جو "فاروقیت" (اور اس اعتبار سے رسالتؐ اور صدیقیتؓ میں بھی) قدم اوّل، قوم کی ذہنیت میں تبدیلی تھی۔ قرآنِ کریم نے جو اعمالِ صالحہ کو ایمان کے ساتھ مشروط رکھا ہے تو اس کا بھی یہی مطلب ہے۔ ایمان تبدیلیٔ ذہنیت کا نام ہے۔ اس کے بغیر اعمالِ صالحہ کا امکان ہی نہیں ہو سکتا۔

لیکن پاکستان میں اقلیت، قانون سازی کو دی گئی ہے اور اس میں بھی کیفیت یہ ہے کہ ——— ڈور کو سلجھا رہے ہیں، اور سرا ملتا نہیں۔ قانون سازی کی مہم، بھنور میں پھنسی ہوئی لکڑی کی طرح ہے، جو ایک ہی جگہ چکر کاٹ رہی ہے اور ایک قدم بھی جانبِ ساحل نہیں بڑھتی۔ اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ ہم نے "فاروقیت" کو نظر انداز کر رکھا ہے۔

قرآنِ کریم نے کچھ اصول و اقدار دیئے ہیں جو ابدی اور غیر متبدّل ہیں۔ یہ اصول و اقدار، ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے، ہر زمانے کی اُمّت باہمی مشاورت سے، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، جزئی قوانین خود وضع کرتی ہے، جنہیں احکامِ شریعت کہا جاتا ہے۔ قرآنی حدود اپنی جگہ محکم اور غیر متبدّل رہیں گی لیکن ان کے اندر وضع کردہ جزئی قوانین ضرورت کے مطابق بدلتے رہیں گے۔ اسی حقیقت کے پیشِ نظر حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ

بے شک خدائے بزرگ و برتر حالات اور زمانے کے تقاضوں سے لوگوں کے لئے نئے نئے مسائل پیدا کرتا رہتا ہے۔ (ص ۲۷۱)

جب آپ نے خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالی ہیں تو حضورؐ کے زمانہ کو گذرے ہوئے (بس یہی) تین چار سال کا عرصہ ہوا تھا۔ لیکن چونکہ اب مملکت کا دائرہ وسیع ہو گیا تھا اس لئے حالات میں کافی تبدیلیاں آگئی تھیں۔ چنانچہ آپ کا طریق کار یہ تھا کہ جب کوئی معاملہ سامنے آتا تو آپ سابقہ ادوار (عہدِ رسالتمآبؐ اور عہدِ صدّیقیؓ) کو دیکھتے۔ اگر کوئی ایسا فیصلہ مل جاتا جو جدید تقاضوں کو بھی پورا کر دیتا تو آپ اسے نافذ کر دیتے۔ اگر اس میں کسی ترمیم و تنسیخ یا حک و اضافہ کی ضرورت ہوتی

تو ترمیم شدہ فیصلہ صادر فرما دیتے۔ اور عندالضرورت جدید فیصلہ نافذ کر دیتے۔ لیکن یہ سب کچھ اُمت کے مشورہ سے ہوتا۔ اس مجلسِ مشاورت میں معمر اور پختہ کار صحابہؓ شامل تھے، لیکن آپ نوجوانوں کی بھی حوصلہ افزائی فرماتے اور اکثر معاملات میں ان سے بھی مشورہ لیا کرتے۔ حتیٰ کہ عورتوں سے بھی (صفحہ ۲۷۲) آپ مشاورت کو کس قدر اہمیت دیتے تھے اور اس میں کس حد تک آزادیٔ رائے ملحوظ رکھی جاتی تھی، اس سلسلہ میں بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن ہم صرف ایک مثال پر اکتفا کریں گے جس کی تاریخ نے بڑی تفصیلات اپنے دامن میں سمیٹ رکھی ہیں۔ قرآن کے معاشی نظام کی رُو سے زمین مملکت کی تحویل میں رہتی ہے۔ ذاتی ملکیت میں نہیں۔ لیکن یہ نظام اپنی انتہائی شکل تک بتدریج پہنچتا ہے۔ رسول اللہؐ نے اس نظام کے ابتدائی دور میں، مختلف قطعاتِ اراضی کو انفرادی تحویل میں تو رہنے دیا تھا لیکن مزارعت (بٹائی یا کرایہ پر کاشت کرانے) کو ربوٰ قرار دے کر اسے ممنوع ٹھہرا دیا تھا۔ یہ مسئلہ مملکتی سطح پر عہدِ فاروقی میں زیرِ بحث آیا جب عراق کی وسیع و عریض زمینیں اسلامی مملکت کے قبضہ میں آئیں۔ اس پر جس گرم جوشی سے (مخالف اور موافق) بحثیں ہوئیں وہ تاریخ میں مذکور ہیں۔ اس باب میں سربراہِ مملکت نے اعلان کر دیا تھا کہ

> میں نہیں چاہتا کہ آپ حضرات میری مرضی کا اتباع کریں اور آپ جسے حق سمجھتے ہیں، اسے میری خاطر چھوڑ دیں۔ میں آپ کی توجہ ایک بات کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ اور وہ یہ کہ خدا کی کتاب جس طرح میرے پاس ہے اسی طرح آپ کے پاس بھی ہے یہی ناطق الحق ہے۔ آپ اسے سامنے رکھ کر جواب دیں کہ اس باب میں اس کا فیصلہ کیا ہے۔ اس پر عمل کرنا ہم سب کا فرض ہے۔ (صفحہ ۳۸۵)

چنانچہ کئی دنوں کی بحث و تمحیص کے بعد، فیصلہ اس آیۂ قرآنی کے مطابق ہوا جسے حضرت عمرؓ نے اس اصول کی تائید میں پیش کیا کہ زمین انفرادی ملکیت میں نہیں بلکہ مملکت کی تحویل میں رہنی چاہیئے تاکہ مملکت افرادِ معاشرہ کو رزق بہم پہنچانے کی ذمہ داری سے عہدہ برا ہو سکے۔ (صفحہ ۲۸۶)

یہ تھا قوانین سازی کے سلسلہ میں "فاروقیت" کا طریقِ کار، جس میں ابدی اور غیر متبدل صرف قرآنِ کریم کے احکام و اصول رہتے ہیں۔ باقی فیصلے قابلِ تغیر و تبدل ہوتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے سابقہ ادوار کے کئی فیصلوں میں تبدیلی کی اور کئی نئے فیصلے صادر فرمائے۔ (انہیں اوّلیاتِ عمرؓ کہا جاتا ہے)۔

یہ ہیں اس "فاروقیت" کی چند جھلکیاں جسے اپنائے بغیر (بقول صدرِ مملکت) نہ معاشرہ کی اصلاح ہو سکتی ہے، نہ قانون سازی کی کوئی کوشش کامیاب۔

———— (۰) ————

ارشادات

(حضرت عمرؓ کے اقوال جو اصولوں کی حیثیت رکھتے ہیں)۔

۱۔ خلافت کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے حساب، دیتے وقت بتایا جا سکے کہ کہاں سے لیا تھا اور

کسے دیا تھا۔ اگر یہ جواب اطمینان بخش ہے تو خلافت، ورنہ ملوکیت ۔۔

۲۔ جب حاکم بگڑ جاتا ہے تو رعایا بھی بگڑ جاتی ہے۔ سب سے بدبخت حاکم وہ ہے جس کے سبب رعایا بگڑ جائے۔

۳۔ اگر تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ اللہ کے ہاں تمہارا کیا مقام ہے تو یہ دیکھو کہ خدا کی مخلوق تمہیں کیا سمجھتی ہے۔

۴۔ کسی قوم سے مقابلہ کے وقت، یہ نہ دیکھو کہ اس کی اخلاقی خرابیاں تمہاری خرابیوں سے زیادہ ہیں۔ دیکھو یہ کہ تمہاری اخلاقی خوبیاں اس سے کتنی زیادہ ہیں۔ یہ ہے کامیابی کا راز۔

۵۔ حکومت کے منصب کے لئے ایسا شخص سب سے زیادہ موزوں ہے کہ جب وہ اس منصب پر فائز نہ ہو تو قوم کا سردار نظر آئے اور جب اس پر فائز ہو تو انہی میں کا ایک فرد معلوم ہو۔

۶۔ ایک گورنر کو لکھا کہ تم اپنی رعایا کے لئے ایسے بن جاؤ کہ اگر تم رعیت ہوتے تو چاہتے کہ ہمارا امیر ایسا ہونا چاہیئے۔

۷۔ ایک اور گورنر کو لکھا کہ ایسے رہو کہ امن پسند تجھ سے بے خوف ہو اور بدقماش خوف زدہ۔

۸۔ عمالِ حکومت کے سلسلہ میں کہا کہ طاقتور خائن اور کمزور دیانتدار دونوں حکومت کے لئے نقصان رساں ہوتے ہیں۔

۹۔ وہی حکومت درست رہ سکتی ہے جس میں نرمی ہو لیکن کمزوری کی وجہ سے نہیں اور سختی ہو لیکن استبداد کی بنا پر نہیں۔

۱۰۔ جو شر پیدا کر کے غالب آیا وہ غالب نہیں مغلوب ہے جو ناجائز طریق سے کامیاب ہوا وہ کامیاب نہیں ناکام ہے۔

۱۱۔ جس میں تکبر دیکھو سمجھ لو کہ وہ احساسِ کمتری کا شکار ہے۔

۱۲۔ اپنا محاسبہ کرو قبل اس کے کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے۔

۱۳۔ جس حاکم کے محل کے دروازے عوام کے لئے بند ہو جائیں وہ قصرِ سعد نہیں، محلِ فساد ہے۔

۱۴۔ کسی شخص کے اخلاق پر بھروسہ نہ کرو جب تک اُسے غصہ کی حالت میں نہ آزما لو۔

۱۵۔ ایک شخص نے کہا کہ مؤمن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی کو دھوکا نہیں دیتا۔ آپ نے فرمایا کہ: فقرہ پورا کرو اور یوں کہو کہ مومن نہ کسی کو دھوکا دیتا ہے نہ کسی سے دھوکا کھاتا ہے۔

۱۶۔ انسان کو چاہیئے کہ اپنے اہل و عیال میں بچوں کی طرح رہے لیکن جب ان کی کوئی ضرورت سامنے آجائے تو مرد بن جائے۔

۱۷۔ ازدواجی زندگی میں مثالی معیار (IDEALISM) کام نہیں دیتا۔ اس میں لچک رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

۱۸۔ جوانوں سے کہا کہ جوانی کے زمانے میں ہر ایسی بات سے بچو جو تمہاری بدنامی کا باعث ہو تاکہ اگر تم بعد میں بڑے آدمی بن جاؤ تو تمہارا ماضی تمہارے لئے وجہِ ندامت نہ ہو۔

۱۹۔ لوگوں کو ان کی ضرورت کے مطابق دو میٹھی میٹھی دینے سے ان کے اخلاق درست نہیں رہ سکتے۔

۲۰۔ جس نے اپنی مدد کے لئے کسی خاندان یا برادری کا نام لے کر آواز دی سمجھ لو کہ وہ شیطان کی آواز ہے۔ اسلام کے بعد خاندانوں، قبیلوں اور برادریوں کی تفریقات ختم ہو جاتی ہیں۔

۲۱۔ اللہ تعالےٰ حالات اور زمانے کے تقاضوں سے نئے نئے مسائل پیدا کرتا رہتا ہے۔ اس لئے ان کے حل کے لئے اجتہاد کی ضرورت ہوتی ہے۔

۲۲۔ عمرؓ کی رائے اور وحیٔ خداوندی میں ہمیشہ فرق ملحوظ رکھو۔ عمرؓ کی رائے ایک انسان کی رائے ہے، جو غلط بھی ہو سکتی ہے، اسے سند اور سنت نہ بناؤ۔

۲۳۔ کسی بات کے جواب میں واللہ اعلم بالصواب مت کہو جو بات نہیں جانتے اس کے متعلق سیدھے طور پر کہو کہ میں نہیں جانتا۔